ماہنامہ
بیداری
حیدرآباد

مدیر
☆☆☆
حافظ محمد موسیٰ بھٹو

زیر اہتمام
☆☆☆
سندھ نیشنل اکیڈمی ٹرسٹ
۴۰۰- بی لطیف آباد ۴- حیدرآباد

E.Mail
m.moosabhutto@gmail.com
www.bedarimillat.com

موبائل نمبر:
03363039299

جلد پندرواں ◯ نومبر ۲۰۱۸ء
قیمت: ۲۵ روپے، سالانہ: ۳۰۰ روپے

اہم تفسیری نکات (آٹھویں قسط)	مولانا اشرف علی تھانویؒ	۲
اہل محبت واہل سلوک کے لئے قرآنی لائحہ عمل	محمد موسیٰ بھٹو	
ستر سالہ کہانی (دوسری قسط)	آمنہ حامد زبیدی صاحبہ	۹
(حافظ محمد موسیٰ بھٹو صاحب سے لیا گیا انٹرویو)	حزب اللہ سومرو	
مسلمانوں کے چار طبقات	مولانا ڈاکٹر سعید الرحمٰن اعظمی ندوی	۲۹
مصنوعی ذہانت کی ٹیکنالوجی	کیون ڈرم	۳۳
اور اس کے اثرات ونتائج		
پرنٹ میڈیا کی اہمیت	عبدالمتین	۴۱
قدرت کے حیرت انگیز کرشمے	سید قطب شہیدؒ	۴۴
اسلام سے بغض وحسد کی آگ کیوں؟	اوریا مقبول جان	۵۳
ہمارے امتحان کی کاپی کا ہمارے اپنے ہاتھ میں ہونا	مولانا مفتی محمد ظہور ندویؒ	۵۷
سلیقۂ انسانیت	محمد موسیٰ بھٹو	۵۹
(جدید طبقات کے لئے قابل غور نکات)		

پبلشرز محمد موسیٰ بھٹو نے یادگار پرنٹنگ پریس حیدرآباد سے چھپوا کر سندھ نیشنل اکیڈمی ٹرسٹ ۴۰۰
بی لطیف آباد-۴- حیدرآباد سے شائع کیا۔ ٹیلیفون: 3861864 (022)

مولانا اشرف علی تھانویؒ آٹھویں قسط
محمد موسیٰ بھٹو

اہم تفسیری نکات

(اہل محبت واہل سلوک کے لئے قرآنی لائحہ عمل)

أَمْ حَسِبْتُمْ أَن تُتْرَكُواْ وَلَمَّا يَعْلَمِ اللّهُ الَّذِينَ جَاهَدُواْ مِنكُمْ. (سورۃ التوبہ، آیت نمبر ۱۶)

(کیا تم خیال کرتے ہو کہ تم یوں ہی چھوڑ دیئے جاؤ گے، ہنوز اللہ تعالیٰ نے ان لوگوں کو تو دیکھا ہی نہیں ہے جنہوں نے تم میں سے جہاد کیا ہو)۔

ثمرات کا مجاہدوں سے حاصل ہونا

یہ آیت اس پر دلیل ہے کہ اللہ کی عادت ہے کہ مجاہدات کے بعد ثمرات عطا کرتے ہیں۔

تشریح:

اس آیت سے معلوم ہوتا ہے کہ دنیا میں افراد کی آزمائش یہ ہے کہ وہ مجاہدوں کے ذریعہ نفس کی قوتوں کو اللہ ورسول کے تابع بنانے کے کام کو کس قدر اہمیت دیتے ہیں، مجاہدوں کے بغیر اللہ کی طرف سے چھوڑ دیئے جانے کے راستے مسدود ہیں۔

اللہ کے لئے کفار سے اخلاص کے ساتھ جہاد کی صلاحیت بھی انہی افراد میں پیدا ہوسکتی ہے، جو نفس کے خلاف مجاہدوں میں قابل ذکر حد تک کامیاب ہوں، جہاد، کفار کے خلاف ہو، مادہ پرست معاشرے کے خلاف ہو یا نفس کے خلاف، ہر طرح کے جہاد کے لئے ذکر وفکر کے مجاہدے ناگزیر ہیں، اس کے بغیر نفس میں وہ قوت وصلاحیت پیدا ہی نہیں ہوسکتی کہ وہ محض اللہ کے لئے سب کے ساتھ صف آرا ہو۔

مجاہدوں میں غیر معمولی تاثیر رکھی گئی ہے، اس سے فرد میں موجود حیوانی اثرات پر

قابو پایا جاتا ہے، فرد کی سیرت وکردار میں نکھار پیدا ہوتا ہے، انسانی جوہروں سے بہرہ وری ہوتی ہے، اللہ کی مخلوق سے محبت وشفقت کے احساسات طاقتور ہوتے ہیں، یہ اللہ کی سنت ہے، ذکر وفکر کے مجاہدوں کے بغیر اس طرح کے ثمرات پیدا نہیں ہوتے، یہ مجاہدوں کے ثمرات وانعامات ہیں، اللہ کا یہ قانون ایسا ہے، جس میں کوئی تبدیلی نہیں ہوتی، ہاں، اللہ جس کے لئے چاہے، اسے اس قانون سے مستثنا کرسکتا ہے، لیکن عام طور پر اس قانون میں تبدیلی نہیں ہوتی۔ چنانچہ غیر معمولی مجاہدوں کے بغیر جن کو بھی خلافت عطا کی گئی، ان میں یہ خصوصیات پیدا نہ ہوسکیں۔ اس دور میں ہمارا مشاہدہ ہے کہ جس فرد کو بھی ذکر وفکر کے برسوں کے مجاہدوں کے بغیر خلافت دی گئی، وہ اگر علمی وعملی صلاحیتوں کا حامل ہے تو وہ جلد ہی شہرت ودولت کی طرف راغب ہونے لگتا ہے۔ مجاہدوں کا فقدان اسے حب جاہ وحب مال سے نہیں بچا سکتا، اس طرح تصوف وطریقت کے نام پر دنیاداری کی راہ اختیار کی جاتی ہے، اللہ کے ذکر کے غیر معمولی مجاہدوں کے بغیر خلافت کی سند فرد کو دنیاداری کی راہ اختیار کرنے سے نہیں بچاسکتی، اگر ہم جیسے اہل تصوف، بزرگوں کے بیان کردہ اس نکتے کو سمجھیں تو وہ اپنی اصلاح کے ساتھ ساتھ تصوف وطریقت کو معاشرے میں بے وقعتی سے بچانے کا ذریعہ بن سکتے ہیں۔ (مرتب)

لَوْ کَانَ عَرَضاً قَرِیْباً وَسَفَراً قَاصِداً لَّاتَّبَعُوْکَ. (سورۃ التوبہ، آیت نمبر۴۲)

(اور اگر لگتے ہاتھ ملنے والا ہوتا اور سفر بھی معمولی سا ہوتا تو یہ لوگ ضرور آپ کے ساتھ ہو لیتے)۔

نفس کے امتحان کا طریقہ

اس آیت میں اپنے نفس کے امتحان لینے کا طریقہ مذکور ہے کہ کوئی دینی کام ایسا ہو، جس کے اندر دنیوی نفع کوئی نہ ہو، بلکہ مشقت ہو، پھر بھی فرد اس کام کو کرتا ہے تو یہ اللہ کی محبت کی دلیل ہے اور اگر ایسا دینی کام ہو، جس کے کرنے میں دنیوی نفع بھی مل سکتا ہے، اس لئے کرتا ہے تو اس کو اللہ سے محبت نہیں۔

تشریح:

ایسا دینی کام جس میں مادی نفع نہ ہو، بلکہ مشقت ہو، مثلاً کچھ لوگ اللہ کے لئے ملنے آتے ہیں، فرد اپنے سارے کاموں کو چھوڑ کر، ان سے اللہ کی محبت کی خاطر وقت گذارتا ہے، انہیں اللہ کے ذکر اور آخرت کی تیاری کی یاد دہانی کراتا ہو، محض اللہ کے لئے تو اس طرح کے ایثار کا مطلب یہ ہے کہ فرد دینی اعتبار سے مستحکم ہے اور وہ امتحان میں کامیاب ہے، جب کہ ایسا دینی کام جس میں مادی منافع ہو، اس دینی کام میں اللہ کی محبت کا جذبہ شامل نہیں، مالی منافع کا جذبہ کارفرما ہے تو یہ دینی کام قابل قبول نہیں، مثلاً مالدار مریدوں کو اس لئے وقت دیا جائے، تاکہ ان سے مالی منافع حاصل ہو، یہ علامت ہے اس بات کی کہ فرد پر نفسی قوتیں حاوی ہیں۔ (مرتب)

عَفَا اللّٰہُ عَنکَ لِمَ أَذِنتَ لَهُمْ. (سورۃ التوبہ، آیت نمبر۴۳)

(اللہ تعالیٰ نے آپ کو معاف کردیا لیکن آپ نے ان کو اجازت کیوں دی تھی)۔

کاملین کے ساتھ اللہ کے عتاب کی نوعیت

اس میں عفو کو شکایت سے پہلے ذکر فرمایا، اللہ تعالیٰ کا باطن میں کاملین کے ساتھ یہی معاملہ ہوتا ہے کہ عین عتاب کے وقت ان پر لطف کا معاملہ بھی فرماتے ہیں، تاکہ ان کو وحشت نہ ہو اور اس میں ایسے شخص کے ساتھ خطاب کرنے کا ادب بھی بتایا گیا ہے، جس کی حرمت کی رعایت کی جائے۔

تشریح:

کامل کے ساتھ اللہ کے عتاب کے وقت اس میں محبت کی آمیزش بھی موجود ہوتی ہے، تاکہ گھبراہٹ میں اضافہ نہ ہو، اللہ کے رسول ﷺ کی بات تو بالکل جداگانہ ہے، لیکن راہ محبت میں چلنے والوں کو بھی اکثر مشاہدہ ہوتا رہتا ہے کہ اگر ان سے کوئی گناہ صادر ہوتا ہے یا ذکر ومجاہدہ میں غفلت واقع ہوتی ہے تو قلب میں انوار کا ورود روک دیا جاتا ہے، جس سے وہ حجابات محسوس کرنے لگتے ہیں، لیکن چونکہ وہ گناہ یا غفلت شعوری نہیں ہوتی، اس لئے حجاب کے فوراً بعد سینہ کو کھول دیا جاتا ہے، اور طالب محسوس کرنے لگتا ہے کہ محبوب کا یہ عتاب سنبھلنے اور محبوب کی طرف مزید رجوع کرنے کا ذریعہ ہوجاتا ہے، یعنی عتاب کے معاً بعد شفقت کا اظہار، یہ اللہ محبوب کی اپنے محبوں کے ساتھ خاص ادا ہوتی ہے، اس ادا سے مقصود طالبوں کی راہ محبت میں ارتقا اور رجوع میں ترقی ہی ہوتی ہے۔

قُل لَّن يُصِيبَنَا إِلَّا مَا كَتَبَ اللّهُ لَنَا هُوَ مَوْلاَنَا وَعَلَى اللّهِ فَلْيَتَوَكَّلِ الْمُؤْمِنُون. (سورۃ التوبہ، آیت نمبر۵۱)

(آپ فرما دیجئے کہ ہم پر کوئی حادثہ نہیں پڑ سکتا مگر وہی جو اللہ تعالیٰ نے ہمارے لئے مقدر فرما دیا ہے، وہ ہمارا مالک ہے اور (اللہ، تو وہ ذات ہے کہ) سب مسلمانوں کو اپنے سارے کام اس کے سپرد کرنے چاہئے، (اس آیت میں توکل کو آسان بنانے کا مراقبہ بتایا گیا ہے اور اس کے بعد تو توکل کا صریح حکم ہے)۔

توکل کے مراقبے کی اہمیت

توکل کا مراقبہ اللہ کی ذات پر اعتماد میں اضافہ کا باعث بنتا ہے اور اپنے سارے کاموں کو اللہ کے حوالے کرنے کا موجب بھی۔

تشریح:

مراقبۂ توکل سے صبر وشکر کی نفسیات پیدا ہونے کے ساتھ ساتھ اللہ کی طرف سے مدد کی بھی عجیب وغریب صورتیں نکلتی رہتی ہیں، توکل کے مراقبہ سے زندگی بھر پیش آنے والے مصائب کے احساس کی شدت ختم ہوجاتی ہے، ذکر کے معمولات کے علاوہ بھی اگر توکل کے مراقبہ کے لئے تھوڑا سا وقت مل سکے تو بہتر ہے، ورنہ کثرت ذکر خود توکل، صبر وشکر جیسی صفات پیدا کرنے کا ذریعہ بن جاتا ہے۔(مرتب)

وَلاَ يَأْتُونَ الصَّلاَةَ إِلاَّ وَهُمْ كُسَالَى. (سورۃ التوبہ، آیت نمبر۵۴)

(لوگ نماز نہیں پڑھتے مگر کاہلی سے)۔

نیک کاموں میں سستی سے عبادت کے کاموں میں لذت سے محروم ہونا

جو لوگ عبادت اور اللہ کے راستے میں خرچ کرنے اور دوسرے نیک کاموں کے کرنے میں سستی کا مظاہرہ کرتے ہیں یا ناگواری سے کرتے ہیں، جیسے کوئی بوجھ لاد دیا گیا ہو، ایسے لوگ عبادت اور بندگی کی لذت سے محروم ہیں اور اللہ کے حسن وجمال سے ناآشنا ہیں۔

تشریح:

عبادت اور ذکر وفکر سے محرومی، اور نماز میں کاہلی اللہ کے حسن وجمال سے ناآشنائی ہی کا نتیجہ ہوتی ہے، اس صورت میں اعمال صالحہ کی خوش دلی سے سرانجامی دشوار تر ہوتی ہے، حقیقت یہ ہے کہ اللہ کے حسن وجمال سے بے بہری اور ناآشنائی کی وجہ سے فرد، مادیت کی طوفانی لہروں کی زد میں آجاتا ہے، بڑے سے بڑا علم اور ذہانت بھی اسے مادیت کے ان طوفانی تھپیڑوں سے بچا نہیں سکتی۔

ایسا فرد سکون سے محروم ہوگا اور نااتفاقی اور ناراضگی کے ساتھ ساتھ کشیدہ تعلقات کے نہ ختم ہونے والے سلسلہ سے دوچار ہوگا، اللہ کے حسن سے عدم بہرہ وری کی وجہ سے اُسے جتنی بھی سزا ملے، وہ کم ہے، اس صورت میں مال ودولت، علم وذہانت سب لاحاصل ہوجاتے ہیں اور وہ فرد کو ظلمات وتاریکی اور نفسی حجابات سے بچانے میں ناکام رہتے ہیں۔

اللہ کے حسن وجمال سے بہرہ وری نماز اور کثرت ذکر سے ہی حاصل ہوتی ہے، جو دل کی آنکھوں کے منور ہونے کا ذریعہ بنتی ہے۔

اس کا ایک نتیجہ معاملات میں بہتری وپاکیزگی اور سب کے ساتھ محبت کی صورت میں ظاہر ہوتا ہے، اس طرح اللہ تعالیٰ کا حسن وجمال فرد کو حسنِ کردار کا صاحب بنا دیتا ہے۔

فَلاَ تُعْجِبْكَ أَمْوَالُهُمْ وَلاَ أَوْلاَدُهُمْ إِنَّمَا يُرِيدُ اللّهُ لِيُعَذِّبَهُم بِهَا فِي الْحَيَاةِ الدُّنْيَا. (سورۃ التوبہ، آیت نمبر۵۵)

(سو ان کے اموال واولاد آپ کو تعجب میں نہ ڈالیں اللہ چاہتے ہیں کہ ان چیزوں کے ذریعہ ان کو دنیوی زندگی میں عذاب میں گرفتار رکھے)۔

اللہ کے مشاہدہ جمال سے حالت پردہ میں ہونا

اس میں اشارہ کیا گیا ہے کہ یہ لوگ عبودیت (بندگی) کی لذت سے اور اللہ کے مشاہدہ جمال سے حالت پردے میں ہیں، محمد بن فضیل کا قول ہے کہ جس شخص کو آمر (حکم دینے والا یعنی اللہ تبارک تعالیٰ) کی معرفت حاصل نہ ہوگی وہ امر (حکم پر عمل پیرا ہونے کے لئے) سستی کا مظاہرہ کرتا ہے اور جب شخص کو آمر (حکم دینے والے یعنی اللہ تبارک وتعالیٰ) کی معرفت حاصل ہوگی وہ اس کے امر (حکم) کو راحت وغنیمت سمجھکر اس پر عمل پیرا

ہوگا۔

آیت کے دوسرے حصہ میں محجوبین (حجاب کی حالت میں رہنے والوں کو تنبیہ ہے کہ وہ جس (دولت) کو راحت کی خاطر جمع کرتے ہیں اس میں ان کو راحت حاصل نہیں ہوگی بلکہ اس کے جمع کرنے اور اس کی حفاظت کے لئے محض مصیبتیں جھیلنی پڑتی ہیں پھر اس میں ان کو ثواب کا اعتقاد اور تعلق مع اللہ بھی نہیں، جس سے ان کی یہ مشقت آسان ہوجائے)۔

تشریح:

اہل دنیا کے مال ودولت سے متاثر ہوکر، ان جیسا بننے کی آرزوؤں کا ہونا، یہ اس بات کی علامت ہے کہ فرد ابھی نفس سے مقابلہ میں ناکامی سے دوچار ہے، ان کے سامانِ زینت کو مستحسن سمجھنے کا لازمی نتیجہ اس مال کے حصول کی آرزوؤں کا ہونا ہے، اس کا نتیجہ آخرت کی فکر کے دب جانے اور مضمحل ہوجانے کی صورت میں ظاہر ہوتا ہے، جو بڑے خطرے کی بات ہے، حقیقت یہ ہے کہ جب تک دنیاداروں اور مالداروں کے زیب وزینت اور راحت کے سامان سے دل میں کراہت پیدا نہ ہوگی، تب تک نفس نہیں سنورے گا۔ اس سلسلہ میں حضرت مجدد الف ثانیؒ کے مکتوب کے درج ذیل الفاظ ہمارے لئے انتباہ کی حیثیت رکھتے ہیں، جس طالب کے دل میں دنیا کی طرف ذرہ برابر بھی میلان موجود ہوگا، وہ واصل باللہ نہیں ہوسکتا، اس کے بعد آپ نے یہ حدیث نقل فرمائی ہے "**الدنیا ملعونة وما فیها ملعون الا ذکر الله** دنیا ملعون ہے اور دنیا میں جو کچھ بھی ہے وہ سب ملعون ہے، سوائے اللہ کے ذکر کے (یعنی اللہ کے کثرت ذکر کی برکت سے دنیا کی ملعونیت کے یہ اثرات مضمحل ہو سکتے ہیں) خط کے یہ الفاظ اور یہ حدیث شریف ایسی ہے، جس کی روشنی میں ہم سب کو جائزہ لینا چاہئے کہ دنیا کے بارے میں ہماری روش کیا ہے؟ (مرتب)

وَقَالُوْا لَاتَنْفِرُوْ فِیْ الْحَرِ. (سورۃ التوبہ، آیت نمبر۸۱)
(اور کہنے لگے کہ تم گرمی میں مت نکلو)

تصوف وسلوک کی ریاضتوں سے روکنے کی روش

جس طرح منافقین لوگوں کو جہاد سے روکتے تھے اور کہتے تھے کہ گرمی میں مت نکلو، اسی طرح حال ہے ان لوگوں کا، جو تصوف وسلوک سے روکتے ہیں اور اس کی سختیاں اور لذتِ دنیا کے چھوٹنے کے ارادے سے، حالانکہ جو عاشق ہوتا ہے، وہ ہر طرح کے مصائب برداشت کرتا ہے، جو اللہ تعالیٰ کی محبت حاصل کرنا چاہتے ہیں، ان کو کچھ مصائب اور لذتیں چھوڑنی پڑتی ہیں۔

تشریح:

اللہ کی راہ محبت میں قدم قدم پر نفس سے معرکہ آرائی کرنی پڑتی ہے، دنیا کے اپنے حصہ سے ایک حد تک دستبردار ہونا پڑتا ہے، اپنا قابل ذکر وقت ذکر وفکر کے لئے دینا پڑتا ہے، غیر ضروری میل وملاقات وتعلقات کو قطع کرنا پڑتا ہے، اس کے بعد کہیں جاکر نفس مہذب ہوتا ہے اور سنورتا ہے، اللہ سے والہانہ محبت کی نعمت عظمٰی سے محروم افراد، راہ محبت کے طالبوں کو اس راہ پر جانے سے روکنے کے لئے کوشاں ہوتے ہیں، ایک تو خود راہ محبت سے فرار اختیار کرتے ہیں، دوسرے چلنے والوں کو روکتے ہیں، یہ المیہ کی بات ہے، راہ محبت میں چلنے والے کو اس راہ میں جو حلاوت محسوس ہوتی ہے، وہ ایسی حلاوت ہوتی ہے کہ اس راہ میں درپیش اس کی ساری مشکلات ومصائب کو آسان کرنے کا ذریعہ بن جاتی ہے، اس لئے حوصلہ مند طالب اس راہ کی ساری مشکلات کو برداشت کرنے کے لئے تیار ہوجاتا ہے، اس کے نزدیک سارے کام اللہ کی محبت کے تابع ہوتے ہیں، ہر وہ کام جو اس راہ میں رکاوٹ ہو، وہ اسے چھوڑنے کے لئے تیار ہوجاتا ہے، اس لئے کہ اللہ سے محبت کا ذوق شوق اسے ایسا کرنے پر اکساتا رہتا ہے۔ (مرتب)

آمنہ حامد زبیدی صاحبہ

ستر سالہ کہانی

(حافظ محمد موسیٰ بھٹو صاحب سے لیا گیا انٹرویو)

(حزب اللہ سومرو)

سوال: اس بات میں کہاں تک سچائی ہے کہ شیخ ایاز صاحب آپکی کوششوں سے اسلام کی طرف رجوع ہوئے؟

جواب: یہ بات صحیح نہیں۔ شیخ ایاز پر اللہ تعالیٰ نے اپنا خاص فضل کیااور اسے اسلام کی نعمت عظمیٰ عطا فرمائی، البتہ آخری دنوں میں شیخ صاحب سے میرا کافی تعلق رہا، چار پانچ ملاقاتیں بھی ہوئیں، ان کی دعاؤں کے مجموعے پر مشتمل کتاب کا پہلا ایڈیشن، میری نظر ثانی اور تفصیلی پیش لفظ کے ساتھ شایع ہوا۔ خط وکتابت بھی ہوتی رہی، جو ہماری طرف سے شایع شدہ کتاب ''شیخ ایاز کے آخری دس سال'' اور ''پیام محبت'' میں موجود ہے۔ ہاں، یہ بات صحیح ہے کہ شیخ ایاز کے اضطراب کو دیکھتے ہوئے میں نے ممتاز مہر صاحب کے ذریعے انہیں مشورہ دیا کہ وہ حضرت ڈاکٹر غلام مصطفیٰ خان صاحب (جو سندھ یونیورسٹی میں شیخ ایاز کی وائیس چانسلری کے دور میں اردو ڈپارٹمنٹ کے سربراہ بھی تھے) جو نقشبندی سلسلے کے نہایت کامل بزرگ ہیں، ان سے غائبانہ طور پر بیعت کا تعلق قائم کریں، الحمدللہ میرے کہنے پر شیخ ایاز نے ڈاکٹر صاحب سے خط کے ذریعے غائبانہ بیعت اختیار کی اور ذکر بھی لیا، شیخ ایاز کا ڈاکٹر صاحب کے نام خط اور اس سلسلے میں ڈاکٹر صاحب کی طرف سے ذکر کی اجازت والا خط، مجھ سے کہیں کھو گیا ہے، لیکن یہ ایک حقیقت ہے۔

سوال: کیا آپ نے دعوتی کام کے سلسلے میں محمد ابراہیم جویو صاحب اور جام ساقی کو بھی خطوط ارسال کئے تھے؟

جواب: محمد ابراہیم جویو صاحب کے نام میرا ایک جامع خط ''پیام محبت'' کتاب میں شامل ہے، جویو صاحب سے کافی عرصہ پہلے، جب ان کا ذہن ایک حد تک صحیح سالم تھا، محترم سکندر صاحب کے ساتھ میں انکے گھر ان سے ملاقات کیلئے گیا تھا، شاہ کا رسالہ اور دوسری اہم کتابیں ان کی خدمت میں پیش کی تھیں۔

جام ساقی کے بارے میں، میں نے شیخ ایاز صاحب سے کچھ معلومات حاصل کیں، انہوں نے بتایا کہ جام ساقی ذہنی طور پر بہت پریشان ہے، میرے پاس آتے رہتے ہیں، وہ کارکن ٹائیپ شخص ہے، دانشورانہ مزاج نہیں رکھتا، شیخ ایاز نے یہ بھی کہا کہ، آپ اگر ان سے ملاقائیں کریں تو شاید وہ اسلام کی صحیح راہ پر گامزن ہو، اس سلسلے میں میں نے ان سے ٹیلیفون پر بھی رابطہ رکھا اور ان سے ملاقات کیلئے ان کے گھر پر بھی گیا، لیکن جام صاحب کی طرف سے کسی دلچسپی کا مظاہرہ نہیں ہوا، انہوں نے تبلیغی جماعت کے ساتھ جانے کیلئے کچھ وقت نکالا تھا اور بزرگوں کے مزارات پر بھی حاضری دیتا تھا، لیکن ایسی شخصیت کیلئے سب سے پہلے مطالعے کے ذریعے صحیح اسلامی فکر سے مستفید ہونا ضروری ہے، تاکہ اسلامی نظریئے پر علمی طور سے پوری طرح اعتماد بحال ہو سکے، لیکن ان کو یہ سعادت حاصل نہ ہو سکی۔

سوال: کیا آپ سندھ میں کمیونسٹ اور سیکیولر نظریاتی تحریکوں کے بارے میں کچھ کہنا چاہینگے؟

جواب: سندھ میں کسی زمانے میں کمیونسٹ فکر بہت طاقتور تھی، جی ایم سید کے قوم پرست نظریے نے کمیونسٹ تحریک کو فروغ دیا، کیونکہ قوم پرست نظریے کی بنیاد مستحکم نہیں ہوتی، قوم پرستی کا نظریہ زیادہ دیر لوگوں کو متحرک نہیں رکھ سکتا۔ قوم پرست تحریک نے جو ذہین افراد تیار کئے، ان کا ایک بڑا طبقہ کمیونسٹ فکر اور کمیونسٹ تحریک میں چلا گیا، لیکن سوویت یونین کے ٹوٹنے بعد سندھ میں کمیونسٹ فکر میں زوال شروع ہوا، جام ساقی، کامریڈ میر محمد نظامانی، بدر ابڑو اور ممتاز مہر جیسے سینکڑوں دانشور تصوف کی چھاؤں میں پناہ لینے لگے، دوسرے یہ کہ ان کے باہمی شدید اختلافات نے بھی کمیونسٹ تحریک کو نقصان پہنچایا۔

البتہ سندھ کے ساتھ ساتھ پورے ملک میں سیکولر تحریک کافی طاقتور ہے، سیکولرزم کا مطلب ہے عملی، اجتماعی زندگی میں دین سے آزاد، محض عقلیت کی بنا پر زندگی گذارنے کا ڈھنگ (یعنی ایسی زندگی جس میں مذہبی پابندیاں نہ ہوں) اس فکر کو پرانے کمیونسٹ دانشور انتہائی قوت سے فروغ دے رہے ہیں، عالمی سرمائیدار اس تحریک کی سرپرستی کررہا ہے، اور این جی اوز اس تحریک کے فروغ کیلئے کام کررہی ہیں۔

چونکہ سندھ میں قوم پرست اور اور کمیونسٹ تحریک کی فکری بنیاد بڑی حد تک مستحکم رہی ہے، ہزاروں کتابیں اس نظریے کی پس پشت موجود ہیں۔ اور الیکٹرانک میڈیا اور پرنٹ میڈیا بھی اس

تحریک کو فروغ دے رہی ہیں، جس سے لگتا ہے کہ پرانے کمیونسٹ فکر کے حامل دانشوروں کی بڑی تعداد الیکٹرانک میڈیا اور پرنٹ میڈیا پر قابض ہو چکی ہے، اسلئے سندھی میڈیا پر زندگی کے مسائل کے بارے میں اسلامی نقطہ نگاہ پیش کرنے نہیں دیا جاتا۔

اس وقت سندھ کے ساتھ ساتھ پورے عالم اسلام کا سب سے بڑا مسئلہ سیکیولرزم ہے، جسکے مطابق اپنی معاشرتی، اجتماعی اور معاشی زندگی، عقل، عقلیت پرستی اور نفس کی خواہشوں کے تحت گذارنا ہے، جس کے تحت اجتماعی اور معاشرتی زندگی میں اسلام اور اسلامی تعلیمات کو فراموش کرنا ہے اور زندگی کا سارا نقشہ مادیت، مادی آسائشوں اور اور مادی نوعیت کی لذتوں کے مطابق بنانا ہے، سیکیولرزم کی یہ فکر آجکل سب سے زیادہ طاقتور ہے، جو اسلام کے مکمل نظام زندگی کیلئے بہت بڑا چیلنج ہے۔

چونکہ، یہ فکر نفس کی خواہشوں کے مطابق ہے اور عالمی سرمائیدار اس فکر کو فروغ دینے کیلئے عالم اسلام میں اربہا ڈالر خرچ کر رہا ہے، ہمارے سندھی دانشور بھی عام طور پر آجکل اس فکر کے فروغ کیلئے بہت کام کر رہے ہیں۔

سندھ کے کمیونسٹ دانشور محمد ابراہیم جویو صاحب نے اپنی عمر کے آخری حصے میں ''سیکیولرزم اور عقلیت پسندی'' کے نام سے کتاب لکھکر، اپنی فکر سے وابستہ افراد کو اس بات پر اکسایا کہ، انسان، کائنات اور زندگی کے متعلق سیکیولر فکر پر قائم رہو۔

الغرض کہ، سندھ میں کمیونسٹ اور قوم پرست تحریک نے سیکیولر فکر کی صورت اختیار کر لی ہے، لیکن چونکہ اس تحریک کے کئی بڑے دانشور دین، مذہب اور تصوف کی چھاؤں میں پناہ لینے پر مجبور ہوئے ہیں، اسلئے سندھ میں اس تحریک کی بنیاد ایک حد تک کمزور ہوچکی ہے، نئی نسل کی اسلامی اعتبار سے رہنمائی کر کے انہیں سیدھے رستے پر لانے اور ان کی تربیت کیلئے اگر ذہین دینی افراد سامنے آئیں تو سندھ میں اسلامی نظریئے کے پھولنے کیلئے سنہری موقعہ ہے۔

سوال: کیا ناسازگار حالات اور وسائل کے بغیر بھی دعوتی اور علمی کام ہوسکتا ہے؟

جواب: دینی کام کیلئے اصل چیز جذبہ، اضطراب، تحرک، اخلاص، استقامت، صلاحیت اور بہتر حکمتِ عملی کی ضرورت ہوتی ہے، اگر یہ چیزیں موجود ہیں، تو پھر اللہ کی طرف سے مدد کی صورتیں پیدا ہوتی رہتی ہیں، چاہے بڑے پیمانے پر نہ سہی، لیکن کسی نہ کسی حد تک کام ضرور ہوتا رہیگا۔ لیکن اگر یہ چیزیں موجود نہیں، تو وسائل چاہے کتنے بھی موجود ہوں، سارے وسائل کے باوجود کام نہیں ہوسکتا۔ معلوم ہوتا ہے کہ اصل چیز تعلق باللہ، دینی حمیت اور اخلاص ہی ہے، ان صفات کے بعد اللہ کی طرف سے راہیں آسان کردی جاتی ہیں، اور برکت کا سلسلہ شروع ہوجاتا ہے، اس لئے علمی کام کرنے والے باصلاحیت افراد کو زیادہ سے زیادہ فکر، اللہ سے اپنے تعلق کو مستحکم کرنے میں صرف کرنا چاہئے، اللہ تعالیٰ ایسے افراد کو زمانے کے رحم وکرم پر نہیں چھوڑتے۔

سوال: آپ نے اہل تصوف سے تعلق قائم کرنے سے پہلے، کیا اہل تصوف کی کتابوں کا مطالعہ کیا تھا؟

جواب: میں نے ۱۹۷۲ع سے اہل تصوف کی کتابوں کا مطالعہ شروع کر دیا تھا، مولانا سید ابوالحسن علی ندویؒ کی کتابیں مسلسل میرے مطالعے میں رہتی تھیں۔ ۱۹۷۲ع سے ۱۹۸۴ع تک میں نے تصوف کی بہت ساری کتابیں پڑھیں، اہل تصوف کی کتابوں میں اخلاص، للھیت، بے نفسی اور باطنی بیماریوں سے بچنے پر بہت زیادہ زور تھا۔ کتابوں کے مطالعے کے ذریعے کوشش کی کہ دل میں اخلاص پیدا ہو، باطنی برائیوں سے حفاظت کی صورت پیدا ہو، لیکن ساری کوشش کے باوجود عملی طور پر ایسا نہیں ہو سکا۔ ایک بار جماعتِ اسلامی کی صاحب علم شخصیت، میاں محمد شوکت صاحب جو جماعت اسلامی میں شامل ہونے سے پہلے، مولانا حسین احمد مدنیؒ سے بیعت تھے اور برسوں تک ان سے روحانی فیض حاصل کرتے رہے تھے، میں نے ان سے ذکر کیا کہ، اہل تصوف اخلاص، للھیت، عبادت میں ذوق وشوق اور اللہ کی محبت کی جن کیفیات پر زور دیتے ہیں، کافی کوشش کی ہے کہ یہ کیفیات حاصل ہوں، لیکن کامیابی نہیں ہوئی، میاں صاحب نے کہا کہ، یہ چیزیں کتابوں کے مطالعے سے حاصل نہیں ہونگی، بلکہ یہ تو کسی اللہ والے سے باقاعدہ تعلق کے نتیجے میں ہی پیدا ہونگی۔

اس سے اندازہ لگائیں کہ، برسوں تک تصوف کی کتابیں پڑھنے کے باوجود، عشق ومحبت کے معمولی اجزاء بھی حاصل نہ ہوسکے، دوسری طرف ۱۹۸۴ع کے آخر میں اہل اللہ سے تعلق قائم ہوا، تو یوں محسوس ہوا، گویا نئی زندگی مل گئی ہو۔

سوال: آپ تصوف سے اپنی عملی وابستگی کی تفصیل بتائینگے؟

جواب: تصوف میں سالک، نفس کی قوتوں کو فنا کرنے، اللہ کے ساتھ باقی رہنے کی مستقل حالت کے حصول کیلئے جو مجاہدے اور ریاضتیں کرتا ہے، وہ سالک اور محبوب کے درمیاں ذاتی نوعیت کے معاملات ہوتے ہیں، وہ ظاہر کرنے والے نہیں ہوتے۔

سوال: اگر آپ، افراد میں شوق پیدا کرنے کیلئے کچھ تفصیل بتائیں تو اس سے شاید مجھ

جیسے افراد میں، راہ سلوک میں چلنے کی طلب اور امنگ پیدا ہو؟

جواب: آپ کے ذوق کو دیکھتے ہوئے، جزوی طور پر کچھ باتیں بتاتا ہوں۔

میں کافی وقت سے تصوف کی کتابیں پڑھتا رہا تھا اور روحانی کیفیات کے حصول کیلئے دل میں طلب بھی موجود تھی، اسی طلب میں اضافہ ہوا اور میں ۱۹۸۲ء میں پیر ایرانی شاہ صاحب سے بیعت ہونے کیلئے پروفیسر عبدالقادر لغاری صاحب کو ساتھ لیکر سکھر گیا، پیر صاحب سکھر میں سال کے چند مہینے گذارتے تھے، ان کا اصل مرکز حیدرآباد میں پریٹ آباد تھا۔

سوال: پیر ایرانی شاہ صاحب کون تھے؟

جواب: پیر ایرانی کا اصل نام صبغتہ اللہ تھا، سید تھے، ایران میں فوج میں میجر تھے، یہ ۱۹۲۰ء کے زمانے کی بات ہے، وہاں ان کا ایک بزرگ سے تعلق قائم ہوا، بزرگ نے انہیں سلوک میں چلایا، پھر بزرگ نے ان سے کہا کہ ''تمہاری طلب بہت زیادہ ہے، میرے پاس جو فیض تھا، میں نے تمہیں دے دیا، اب تم ہندستان جاؤ، وہاں تمہیں انشاء اللہ بہت اچھے بزرگ ملینگے، جو تمہیں سلوک میں بہتر طور پر چلا کر تمہاری تشنگی پوری کرینگے، یہ پاکستان بننے سے کافی پہلے کا ذکر ہے، شاہ صاحب ''مری'' آئے، مری میں ان دنوں ایک نامور بزرگ رہتے تھے، وہ ان سے ملے تو بزرگ نے کہا کہ مجھے تمہارا انتظار تھا۔

اس کے بعد ان کی طلب کو دیکھتے ہوئے بزرگ نے انہیں مجاہدوں کی راہ پر چلایا، دس برس تک وہ عشاء کی نماز کے بعد صبح کی اذان تک حالتِ مراقبہ میں رہتے تھے۔ جب باقاعدہ سلوک طے ہوگیا تو بزرگ نے انہیں سندھ بھیجا کہ وہ وہاں جاکر لوگوں کی اصلاح اور تربیت کا کام شروع کریں، سندھ میں انہوں نے حیدرآباد کو اپنا مرکز بنایا، انکی ملفوظات پر مشتمل پانچ، سات کتابیں موجود ہیں، جن کے مطالعے سے ان کی روحانی استعداد کا اندازہ ہوتا ہے، تصوف کو بہتر انداز سے پیش کرنے کی ان میں غیرمعمولی صلاحیت موجود تھی، خاص طور پر جدید دور کے علمی افراد کیلئے ان کی کتابیں بہت قیمتی ہیں۔

سوال: پیر ایرانی شاہ صاحب سے آپ نے کتنا وقت استفادہ کیا؟

جواب: پیر صاحب سے میں کوئی خاص استفادہ نہ کر سکا، کیونکہ اس وقت مجھ میں حقیقی طلب پیدا نہیں ہوسکی تھی، وقتی اور ہنگامی جذبہ تھا، جو جلد ہی ٹھنڈا ہوگیا، میں تقریبا دو سال تک صحافتی اور تصنیف وتالیف کے کام میں مصروف رہا، لیکن اس دوران یہ خواہش بڑھتی رہی، اب حقیقی طلب پیدا ہوئی اور اندرونِ سندھ کے ایک نوجوان بزرگ سے صحبت کا تعلق قائم ہوا، پھر چار برس تک بزرگ سے تعلق قائم رہا۔ ان کی صحبت کیلئے ہر مہینے دو دن کیلئے میں ان کے پاس جاتا رہا، لیکن ایک تو میرا ذکر کا سلسلہ جاری نہیں ہو سکا تھا، بس صحبت اور نظر کا فیض تھا، ان کی خانقاہ میں بزرگ کی ذات میں فنا ہونے کی فضا موجود تھی، فنا فی الشیخ کا یہ خانقاہی نظام میرے مزاج کے خلاف تھا، بہرحال بزرگ سے جتنا عرصہ تعلق رہا، ذکر نہ ہونے کے باوجود مجھے روحانی طور پر کافی فائدا ہوا، اس سے تصوف کی قوت کا اندازہ ہوا۔

سوال: ڈاکٹر غلام مصطفیٰ خان صاحب نے آپ کو باقاعدہ راہ سلوک میں چلایا یا فیض نظر میں رکھا؟

جواب: فیض نظر کی ایک صورت تو یہ ہوتی ہے کہ بزرگ تسخیری وظائف کا عامل ہو، اور نظر کو ایک نکتے پر جمانے کی مشقوں کا حامل ہو، جس سے ان کی شخصیت میں غیرمعمولی کشش محسوس ہو، ڈاکٹر صاحب اس قسم کے تسخیری نوعیت کے عمل کے قائل نہ تھے۔

فیض نظر کی دوسری صورت، جو حقیقی اور فطری صورت ہے، وہ یہ ہے کہ بزرگ، ذکروفکر کے غیرمعمولی مجاہدوں اور اپنے شیخ کی طویل عرصے کی صحبت کے نتیجے میں حالت فنا سے حالت بقا تک پہنچا ہو، جس سے ان کے نفس کی سرکش قوتیں مضمحل ہوچکی ہوں اور وہ بزرگ زہد وتقویٰ کا نمونہ بن چکا ہو، ایسے بزرگ کی صحبت کی تاثیر سے فرد کی زندگی میں حیرت انگیز طور پر تبدیلی کا عمل شروع ہوجاتا ہے، کوئی فرد اگر اس قسم کے بزرگ کی صحبت اختیار کرکے، ذکر وفکر شروع کردے تو دس، پندرہ برس کے دوران روحانی ترقی کرکے کہیں سے کہیں پہنچ جاتا ہے۔

سوال: ڈاکٹر غلام مصطفیٰ خاں صاحبؒ کی صحبت سے آپ کو خاطرخواہ فائدہ محسوس ہوا؟

جواب: ڈاکٹر صاحب سے میرا تعارف بہت پرانا تھا، ''جسارت'' اخبار میں میرے مضامین بھی ڈاکٹر صاحب کی نظر سے گذرتے تھے، ڈاکٹر صاحب نے میری حقیقی طلب کو دیکھتے ہوئے، مجھے باقاعدہ سلوک میں چلایا، اب میری سرگرمیوں اور جدوجہد کا مرکز سلوک ہی بن گیا، دوسرے سارے کام پس پشت چلے گئے، تقریبا روزانہ ڈاکٹر صاحب کی صحبت حاصل ہوتی رہی، عصر کی نماز میں ڈاکٹر صاحب کی مسجد میں پڑھتا تھا، مغرب کی نماز کے بعد وہاں سے واپسی ہوتی تھی، یہ میرا روز کا معمول بن گیا تھا۔ ڈاکٹر صاحب کے پاس ہر سطح کے افراد آتے تھے، لیکن ان سے قریب ہونے کے باوجود میں ان کو پہچانتا نہیں تھا۔ کیونکہ سلوک ایسی چیز ہے، جو فرد کو ادھر ادھر دیکھنے سے دور کردیتی ہے، اور فرد کا اصل مقصد نفس کی قابل ذکر حد تک اصلاح، اور اللہ سے تعلق مستحکم کرنا بن جاتا ہے۔ ڈاکٹر صاحب سے میری صحبت ۱۷ سال تک رہی، اور لگ بھگ

پندرہ برس تو روزانہ رہی، اس میں ملاقات اور گفتگو بہت کم ہوتی تھی، بس دور سے زیارت ہوتی تھی، البتہ ڈاکٹر صاحب جمعہ اور پیر کے دن ہونے والے اجتماعی مراقبے کے موقعے پر مجھے اپنے قریب بٹھاتے تھے، میں اگر دور بھی بیٹھا ہوتا تو اشارہ فرما کر، مجھے اپنے قریب بلاتے تھے، یہ ڈاکٹر صاحب کی خاص محبت ہوتی تھی، ان کی اسی محبت کے طفیل سترہ سال شب وروز چلنے سے سلوک کا یہ سفر کسی حد تک طے ہوگیا اور نقشبندی مجددی سلسلے کے سارے اسباق پورے ہوئے۔

سوال: آپ نے ''کسی حد تک'' سلوک طے ہونے کی بات کی ہے، اسکی وضاحت کرینگے؟

جواب: راہ محبت اور راہ سلوک میں سالک کو نفس کی اتھاہ قوتوں کا جو اندازہ یا تجربہ ہوتا ہے، اور اللہ کی جس شان عظمت کا مشاہدہ حاصل ہوتا ہے، وہ ایسا ہے جس میں سالک سمجھتا ہے کہ اللہ کے بندوں میں مجھ سے زیادہ گنہگار اور سیاہ کار دوسرا کوئی نہیں ہوسکتا اور اللہ کے عتاب کا سب سے زیادہ مستحق میں ہی ہوں، سالک پر یہ احساس مستقل طاری رہتا ہے، یہی احساس اسے بزرگ بننے کی نفسیات سے بچاتا ہے اور بزرگی کی دعویٰ سے بچاتا ہے، یہی احساس ہے، جس کی وجہ سے اس پر اللہ تعالیٰ کا فضل شامل حال رہتا ہے، اللہ اسے اِدھر اُدھر دیکھنے اور دنیا دارانہ لائین اختیار کرنے سے بچاتا ہے، یہ احتیاط ہی صوفی کو اللہ کی حفاظت میں دینے کا ذریعہ بن جاتی ہے۔

سوال: کچھ مزید تفصیل بتانا پسند کرینگے؟

جواب: اس سے زیادہ دوسری تفصیل کیا ہوسکتی ہے، ''تصوف'' تو دراصل فرد کا ذاتی مشاہداتی عمل ہے، جس سے فرد لگاتار اندر میں غوطہ زن ہوکر، اپنے نفس کا محاسبہ اور تزکیہ کرتا رہتا ہے، اس محاسبے کے عمل سے وہ موت تک فارغ نہیں ہوتا، وہ مسلسل اپنا احتساب کرتا رہتا ہے، جب بھی اس نے اپنا احتساب چھوڑا، اسی دن وہ نیچے گرنا شروع ہوجاتا ہے۔تصوف میں ''دعویٰ'' صوفی کیلئے زوال کا ذریعہ بن جاتی ہے، اپنے مجاہدوں پر ناز کرنے سے بھی صوفی ڈرتا رہتا ہے، کہ کہیں محبوب حقیقی کو اس کی یہ ادا پسند نہ آئے، اور حاصل شدہ بیش بہا دولت سلب نہ ہوجائے۔

سوال: آپ نے کہا ہے کہ آپ سترہ برس تک مسلسل سلوک کے سفر میں چلتے رہے، لیکن اس دوران سندھی اور اردو زبان میں آپ کی کئی کتابیں شایع ہوئیں، آپ کی ان اہم علمی کتابوں کی اشاعت سے معلوم ہوتا ہے کہ آپ نے اپنا زیادہ وقت کتابوں پر صرف کیا ہے، کتابوں کے تیاری کے ساتھ ساتھ آپ ۱۹۹۲ع سے ۸۰ صفحات پر مشتمل ماہنامہ سندھی رسالہ ''بیداری'' بھی شایع کرتے رہے؟

جواب: ہمارا یہ سارا کام اللہ کے ذکر اور اسکی محبت کی راہ میں چلنے کی برکت سے ہے، اور سلوک میں چلنے کا نتیجہ ہے، حقیقت تو یہ ہے کہ جب کوئی باصلاحیت اور علمی مزاج رکھنے والا فرد راہ سلوک میں چلتا ہے تو اسکے علم اور وقت میں کافی برکت آجاتی ہے، اور اللہ کی مدد اور تائید کی نئی نئی صورتیں اس کے سامنے آنے لگتی ہیں کہ اپنے کام کو دیکھکر فرد خود حیرت زدہ ہوجاتا ہے کہ یہ تو میرے علم، میری ذہنی صلاحیت اور توانائی سے زیادہ کام ہے۔

سوال: کیا سلوک کے سفر کے دوران سالک کا لوگوں سے تعلق متاثر نہیں ہوتا اور اس کے ضروری اور شخصی کام متاثر نہیں ہوتے، اپنے ذاتی تجربے کے حوالے سے بتائیں؟

جواب: سلوک میں عام طور پر لوگ جزوی طور پر چلتے ہیں، یعنی ذکر وفکر کو بمشکل ایک یا ڈیڑھ گھنٹہ وقت دیتے ہیں، مصروف لوگوں، (کاروباری اور ملازمت پیشہ) لوگوں کا سلوک یہی ہے، پوری استقامت کے ساتھ ذکر کو اتنا وقت دینے سے بھی انشا اللہ تعالیٰ چند سالوں میں فرد کی اچھی اصلاح ہوجاتی ہے، البتہ باقاعدہ سلوک میں چلنے والے افراد بہت کم ہوتے ہیں، ہزار میں بمشکل دو چار افراد، ایسے افراد سے آگے چل کر دوسروں کی تربیت کا کام لینا مقصود ہوتا ہے۔ ایسے سالکوں کو درمیانی عرصے میں کم ملنے اور کم بولنے کے اصولوں پر سختی سے عمل کرنا پڑتا ہے، ایسا کرنے سے ''توجہ الی اللہ'' کے ملکے کے راسخ ہونے میں مدد ملتی ہے۔

سوال: آپ کا تصنیف اور تالیف کا کام کب شروع ہوا؟

جواب: ۱۹۷۰ع میں ممتاز دانشور پروفیسر کریم بخش نظامانی صاحب کے ساتھ مل کر ہم نے ''مسلم پبلشنگ ہاؤس'' کے نام سے ایک ادارہ قائم کیا، اس ادارے کی طرف سے پروفیسر موصوف کی اسی سال ''(پرانے) سوشلسٹ کی ڈائری'' اور ''لیلا کے خطوط'' کے نام سے دو کتابیں شایع ہوئیں، موصوف کمیونسٹ رہ چکے تھے، ان کتابوں میں انہوں نے اسلام کے متعلق کمیونسٹ حکمتِ عملی، اور ان کے کام کی طریقہ کو بے نقاب کیا ہے، اس کے بعد اس ادارے سے میری دو کتابیں ''مٹ مٹی جا نہ تھیا'' اور ''سندھ میں بے چینی کے اسباب'' کے نام سے سندھی زبان میں کتابیں شایع ہوئیں، جو ۱۹۷۲ع اور ۱۹۷۴ع میں شایع ہوئیں، اس کے بعد میری کتابوں کا ایک سلسلہ شروع ہوگیا، جس میں ''ہمارے سیاستدان'' ''ذوالفقار علی بھٹو، عروج وزوال کی کہانی'' ''پاکستان کا المیہ، اسباب اور حل'' ''روسی سامراج عالم اسلام کیلئے چیلنج'' یہی کتاب بعد میں ''پرڈیھی سامراج عالم اسلام کے لئے چیلنج'' کے نام سے سندھی زبان میں بھی شایع ہوئی۔

میری یہ کتابیں ۱۹۸۰ع تک چھپ چکی تھیں، ''ذوالفقار علی بھٹو، عروج وزوال کی کہانی'' کے کئی ایڈیشن شایع ہوئے، روسی سامراج والی کتاب سات ہزار کی تعداد میں چھپی، ۸۳ء میں میری دوسری اہم کتاب ''پرین جی پچار'' شایع ہوئی، جس میں سندھ میں آزادی کی تحریک میں اہم کردار ادا کرنے والی علمی، سیاسی اور صحافتی شخصیتوں کے کردار پر تفصیلی بحث کی گئی ہے۔ یہ کتاب سندھ میں تحریک آزادی کے پچاس، ساٹھ سالہ جدوجہد کی کہانی تھی، اُس دور کے سندھی اخبارات کے رکارڈ کو بنیاد بنا کر ایک مکمل تحقیقی کام کیا گیا تھا، جو آنے والے دور کے لئے مستند ماخذ کی حیثیت رکھتا ہے، یہ کتاب اردو میں لکھی گئی تھی، جس کا ترجمہ محترم انور جوکھیو صاحب نے کیا، اس کتاب کے تین ایڈیشن شایع ہوئے، یہ کتاب ۱۹۸۳ع میں شایع ہوئی، اس کے بعد ۱۹۸۴ع میں ایک اہم کتاب ''جدید سندھ کے مسائل اور ان کا حل'' کے نام سے شایع ہوئی، جس میں سندھ کے وہ مسائل، جس کی وجہ سے قوم پرستی کی تحریک کو فروغ ملا، ان کا تفصیلی جائزہ لیکر ان کا حل پیش کرنے کی کوشش کی گئی ہے، سندھ کے علمی حلقوں میں اس کتاب کو بہت پسند کیا گیا۔

۱۹۸۴ع میں دو اہم کتابیں شایع ہوئیں ایک ''تنقیدیں اور تجویزیں'' کے نام سے، جو ممتاز صحافی مولانا خیر محمد نظامانی صاحب کے پچاس سالہ اخباری ادارتی نوٹوں کے مجموعے پر مشتمل تھی، اس کتاب میں شامل مضامین آج بھی قومی اور ملی حالتوں اور کفر کی عالمی طاقتوں کی طرف سے عالم اسلام کو درپیش چیلنج کے نقطۂ نگاہ سے اہم ترین کتاب نظر آتی ہے، مولانا خیر محمد نظامانی کو اللہ تعالیٰ نے غیر معمولی ذہانت اور بصیرت عطا کی تھی، اور انہیں سندھی زبان پر بھی عبور تھا۔

موصوف اگر مستقل مزاجی سے لکھتے تو سندھی زبان میں لادین فکر کے مقابلے کی بہتر صورت پیدا ہوسکتی تھی، لیکن استقلال کی کمی کی وجہ وہ اس سلسلے میں کوئی خاص کام نہ کر سکے۔

سندھی زبان میں ہمارا باقائدہ نظریاتی، فکری اور علمی کام، جو پوری منصوبہ بندی سے شروع ہوا، وہ جنوری ۱۹۸۵ع سے ہوا، کمیونزم، قوم پرستی، ترقی پسندی، سیکیولرزم اور اسلام کے نظریے سے متعلق علمی اور استدلالی طور پر ہر مہینے ایک کتاب شایع ہوتی رہی، جو سندھ کے علمی اداروں کے پروفیسروں، قوم پرست اور ترقی پسند دانشوروں کو ہر مہینے باقاعدہ اعزازی طور پر بھیجنے کا سلسلہ شروع ہوا۔ آٹھ، دس برس کے اندر ان موضوعات پر ایک سو سے زیادہ کتابیں شایع ہوئیں، اور علمی ذوق رکھنے والے افراد تک پہنچتی رہیں، الحمدللہ یہ کام آج تک کسی حد تک جاری ہے۔

سوال: کیا آپ اپنے اس فکری اور علمی کام کے اہداف بتائینگے؟

جواب: پہلا ہدف ترقی پسند اور سیکیولر فکر کی روک تھام تھا، تاکہ ہمارا روایتی مذہبی معاشرہ جدید فکر کی تیز لہروں میں بہہ جانے سے بچ سکے، دوسرا ہدف یہ تھا کہ ذہین اور باصلاحیت نوجوانوں کی اسلامی نقطۂ نظر سے ذہنی اور علمی تربیت ہو، تاکہ وہ سندھی زبان میں اسلامی فکر کو اپنے اپنے حلقے میں پورے اعتماد اور جرئت سے پیش کرسکیں۔ تیسرا ہدف یہ تھا کہ ایسے لکھنے والے تیار ہوں، جو علمی محاذ پر اسلامی اعتبار سے کام کرسکیں۔ چوتھا ہدف یہ تھا کہ اپنی دینی، اخلاقی اور روحانی تربیت کے ساتھ ساتھ، اپنے دوست احباب کی بھی تربیت ہو۔

سوال: کیا آپ کو مقاصد میں کامیابی حاصل ہوئی؟

جواب: الحمدللہ، دینی اعتبار سے اپنی ذمیداریاں ادا کرنے کی حتی الامکان کوشش ہوئی، کافی باصلاحیت افراد ملے، اور جدید فکر کے مقابلے میں مارکیٹ میں اسلامی فکر کو سامنے لایا گیا، جس کے کچھ مثبت اثرات مرتب ہوئے۔

سوال: کیا آپ ایسے افراد کے نام بتا سکتے ہیں، جو آپکے قریب آئے، اور آپ نے ان سے کام کی توقعات بھی وابستہ کیں؟

جواب: ایسے افراد میں عبدالخالق شیخ صاحب، نذیر احمد مہر صاحب، حفیظ اللہ عباسی صاحب، عنایت اللہ مہر صاحب، غلام عباس مہر صاحب، حماد اللہ بھٹو صاحب، مولوی نیک محمد صاحب، ڈاکٹر عبدالحفیظ سموں صاحب، عبدالقدیر کانجوں صاحب اور عبدالجبار عبد صاحب جیسے کافی دوست ہیں۔

سوال: ان دوستوں نے آپکا کہاں تک ساتھ دیا؟

جواب: ان میں کچھ دوست تو اپنی جگہ پر کام کررہے ہیں، جو بڑی خوشی کی بات ہے، لیکن کافی دوست ساتھ چھوڑ گئے ہیں، حقیقت یہ ہے کہ، موجودہ دور میں خوشحال معاشی زندگی، بہترین گاڑی، شاندار بنگلہ، اور زیادہ سے زیادہ مال جمع کرنے کا جو کلچر، مغرب سے ایک طوفان کی صورت میں ہماری زندگیوں میں آکر شامل ہوا ہے، اس طوفان میں عام طور پر مجھ جیسے سینکڑوں افراد بہہ گئے ہیں، اب زندگی کا سب سے بڑا ہدف ''خوشحال معاشی زندگی'' کا حصول بن گیا ہے، اسلئے ایسے باصلاحیت افراد کم ہیں، جو اپنی ذاتی اصلاح اور دعوتی کام کو زندگی میں اولین ترجیح دیتے ہوں۔

بعض نوجوانوں کے متعلق یہ توقع تھی کہ، وہ زندگی بھر ساتھ دینگے، لیکن مادیت کی تیز لہروں نے ایسے ذہین نوجوانوں کو بھی اپنی لپیٹ میں لے لیا۔ پھر بھی اللہ کا شکر ہے کہ نئے، نئے

افراد ملتے رہتے ہیں۔

سوال: آپ نے سیکیولرزم کے بڑھتے ہوئے رجحان کا ذکر کیا ہے، ملک میں اور خاص طور پر سندھ میں سیکیولرزم کے ان بڑھتے ہوئے اثرات کیلئے تصوف کی زیادہ ضرورت ہے یا علمی نوعیت کے اداروں کی؟

جواب: تصوف باطن کی پاکیزگی کا ذریعہ ہے، اس لئے تصوف سے وابستہ بزرگ اگر افراد کی صحیح تربیت کے کام کو اولین ترجیح دیں، اور تصوف میں اپنے ذاتی مقاصد کو پس پشت ڈال کر خلوص سے انکا تزکیہ کریں تو اہل تصوف سیکیولرزم کی روک تھام کیلئے اہم کردار اور کر سکتے ہیں۔

جدید چیلنج کا سامنا کرنے کیلئے علمی اداروں کی بھی ضرورت ہے، اور ایسے اہل علم کی بھی، جو سیکیولر اور ترقی پسند فکر کی نوعیت کو سمجھکر، اسلامی تعلیمات کو جدید ذہنی سطح کے مطابق پیش کرسکیں، اس اعتبار سے دیکھا جائے تو علماء کرام کی ذہنی سطح جدیدیت کے چیلنج سے مطابقت نہیں رکھتی، ان پر فتویٰ والا رنگ غالب ہے، جدید نسلوں کو سنبھالنے اور اسلام پر ان کے اعتماد کو بحال کرنے کیلئے فتویٰ کا انداز، جدید فکر سے متاثر افراد کو مزید دور کرنے کا باعث ہے۔

ان حالات میں جدید نوعیت کے علمی کام کی سخت ضرورت ہے، جسکے ذریعے اسلام کے حق میں بہترین علمی لٹریچر تیار کرکے، اعزازی طور پر پھیلایا جائے، ساتھ ہی اس بات کی بھی ضرورت ہے کہ دینی طبقے اپنے دائراتی خول سے بلند ہوکر، اس قسم کے لٹریچر کا مطالعہ کریں اور موجودہ اور آنے والی نسلوں کو دوستانہ ماحول میں سیکیولر فکر سے بچانے کی کوشش کریں۔

سوال: اس سلسلے میں آپکے ادارے کی سندھی زبان میں شایع شدہ کتابیں کافی اہم ہیں، لیکن بہت ساری کتابوں کے مطالعے کا لوگوں کے پاس وقت نہیں ہے، آپ چند اہم کتابوں کے نام تجویز کریں، جن سے جدید فکر کی نوعیت کو سمجھنے میں، اور اسلام پر اعتماد بحال ہونے میں مدد ملے۔

جواب: الحمدللہ، اس سلسلے میں ہمارے ادارے نے ۳۵ سالوں میں کافی کتابیں شایع کی ہیں، جن میں سے کئی کتابیں اب ہمارے پاس نہیں رہیں، لیکن جو موجود ہیں، ان میں سے کچھ اہم کتابوں کی نشاندہی کی جارہی ہے، (۱) ترقی پسند فکر کا تنقیدی مطالعہ (۲) جیسا میں نے دیکھا (۳) سیکیولرزم اور عقلیت پسندی (۴) تھیا کریسی (۵) مغربی تہذیب اور اسلامی تہذیب، تقابلی مطالعہ۔ (۶) اسلام مسلمان اور قوم پرستی، (۷) اسلام، کائنات اور قانونِ فطرت (۸) ہندو دانشور، اسلام کی شاہراہ پر (۹) قومیت، ایک تجربہ، ایک مطالعہ (۱۰) کمیونسٹ منشور (۱۱) خدا، اسلام اور جدید سائنس (۱۲) حق کا پیغام (۱۳) اسلامی منشور (۱۴) اسلامی فکر کی نئی تشکیل۔ (۱۵) اسلام میں علاقائی حقوق کا تصور (۱۶) عالمی امن کا اسلامی منشور (۱۷) نوجوانوں کے مسائل اور ان کا حل۔ (۱۸) پرویزی فکر، ایک مطالعہ، ایک جائزہ۔ (۱۹) جدید علم کا چیلنج۔

سوال: سوشل میڈیا اس وقت کروڑوں افراد کے خیالوں میں فساد پیدا کرنے اور اسلام کے متعلق شکوک وشبہات پیدا کرنے کا ذریعہ بن گیا ہے، کیا سوشل میڈیا کو صحیح دینی فکر کے فروغ کے مقصد کیلئے استعمال کیا جا سکتا ہے؟

جواب: سوشل میڈیا کا محاذ، انتہائی اہم محاذ ہے، اسے اسلام کے فروغ کیلئے استعمال کرنا وقت کی اہم ضرورت ہے، لیکن اس کے لئے صحیح، باصلاحیت اور ایمان و یقین سے سرشار دینی اسکالرز کی ضرورت ہے، جو حکمت وفراست سے کام لیکر اسلام اور امت پر ہونے والے ہر اعتراض کا ٹھنڈے دل ودماغ سے مثبت جواب دیں اور مثبت فکر پیش کریں۔ اس سلسلے میں ہمارا ایک باصلاحیت سندھی دانشور چند سالوں سے کام کررہا ہے، اس کا کام بہت کارآمد ہے۔ جس سے سندھ کا سیکیولر حلقہ بہت پریشان ہے، ہمارا یہ اسکالر دوست کافی لوگوں پر اثر انداز بھی ہوا ہے، بے شمار افراد ان کا پروگرام دیکھ رہے ہیں۔ وہ اسلام کے نظریاتی مقصد کیلئے سوشل میڈیا کے محاذ کو بہتر طور پر استعمال کررہا ہے۔ ضرورت اس بات کی ہے کہ مزید ایسے باصلاحیت افراد سامنے آئیں۔ آج کے دور میں سوشل میڈیا پر کام کرنے کیلئے ''تعلق باللہ'' کی زیادہ ضرورت ہے، اس کے بغیر حکمت اور استقامت کے ساتھ کام کرنا مشکل ہے، بلکہ فوائد سے زیادہ فرد کی اپنی دینی حالت کے کمزور ہوجانے کا خدشہ ہے۔

سوال: آپ نے تصوف اور ذکر وفکر کے ذریعے افراد کا ایک طبقہ پیدا کرلیا ہے، کیا ان میں جدیدیت کے چیلنج کا سامنا کرنے والے افراد بھی تیار ہوئے ہیں؟

جواب: ہماری یہ کوشش رہی ہے کہ ذکر وفکر کے ساتھ دوستوں میں جدید دور کے چیلنج کا شعور بھی پیدا ہو۔ ہمارے ہاں ذکر وفکر کا ہفتہ وار حلقہ ہوتا ہے، اس میں ذکر کے ساتھ ساتھ تقریبا ہر موضوع پر گفتگو ہوتی ہے، خصوصا موجودہ دور میں سیکیولر نقطۂ نگاہ کے عام ہوجانے اور مذہب کو زندگی کے خاص دائرے تک محدود رکھنے، عملی، اجتماعی اور معاشرتی زندگی کی نفسی خواہشوں کے مطابق تشکیل، اور اس قسم کے رجحانات کے خلاف بہتر ذہن سازی کی کوشش ہوتی ہے۔ تصوف اور ذکر وفکر کی طرف باصلاحیت افراد کا رجوع کم ہونے کی وجہ سے ہمیں اس سلسلے میں کوئی خاص

کامیابی تو حاصل نہیں ہوسکی ہے، لیکن الحمدللہ، پچھلے دس، پندرہ سالوں میں کام کے کچھ ساتھی مل گئے ہیں۔ پچیس، تیس سال پہلے کے ساتھیوں میں اکثریت ان کی تھی، جو مادیت کے طوفانی ریلے میں بہہ گئے، لیکن دس، پندرہ برس سے بعض دوست ایسے ملے ہیں، جو روحانی تربیت کے ساتھ ساتھ ذہنی اور علمی صلاحیتوں کے اعتبار سے بھی بہتر کام کر رہے ہیں۔

سوال: صحافت میں آپکا کن اخبارات اور رسائل سے تعلق رہا؟

جواب: روزانہ ''عبرت'' میں پانچ، سات ماہ تک، روزنامہ ''الوحید'' سے اس کے اجراء سے لیکر، بند ہونے تک (یعنی جنوری ۱۹۷۰ء سے اپریل ۱۹۷۱ء تک) روزنامہ ''جسارت'' کراچی سے جنوری ۱۹۷۱ء سے دسمبر ۱۹۸۳ء تک) درمیاں میں بھٹو صاحب کے دور حکومت میں ''جسارت'' اخبار تین، چار سال تک بند رہا، اسکے بعد لاہور کے ''بادبان'' اور ''لیل ونہار'' سے میں وابستہ رہا۔ ۱۹۸۳ء میں جسارت کو چھوڑنے کے بعد چار سال تک روزنامہ ''جنگ'' سے وابستہ رہا، میں ان سارے اخبارات میں مضمون نگار کی حیثیت سے کام کرتا رہا۔ جنگ میں اعزازی طور پر لکھتا رہا، باقی اخبارات ورسائل میں ہمہ وقتی کارکن کی حیثیت سے کام کیا ہے۔

سوال: صحافت سے اتنے عرصے تک وابستگی کے دوران آپ کو کچھ اہم تجربات اور مشاہدات ہوئے ہونگے، ان کے بارے میں کچھ بتائیں؟

جواب: سب سے پہلے تجربہ مولانا خیر محمد نظامانی کے مزاج کا ہوا۔ مولانا ''الوحید'' کے اجراء سے سات آٹھ ماہ پہلے جماعتِ اسلامی صوبۂ سندھ کے دفتر میں رہے، دفتر میں اس وقت باقاعدہ کوئی معاون دفتر نہیں تھا۔ الحمدللہ، مجھے مولانا کی ہر قسم کی خدمت کرنے کا موقعہ ملا، جسے میں اپنے لئے باعثِ سعادت سمجھتا ہوں، لیکن مولانا اپنے نقطۂ نگاہ کے معاملے میں مزاجا سخت تھے، وہ جس معاملے میں بھی کوئی رائے قائم کرتے تھے، اس رائے پر اٹل رہتے تھے، اخبار کے مالکان کی الگ رائے ہونے کی وجہ سے وہ اخبار سے کنارہ کش ہوجاتے، مولانا ساری زندگی اسی پالیسی پر عمل پیرا رہے، ''الوحید'' اخبار کی سال بھر کی ادارت کے دوران مولانا نے دوبار اخبار کی ادارت سے استعفیٰ دیا، بڑی مشکل سے مولانا کو منایا گیا۔

''الوحید'' کے بعد میرا تعلق روزنامہ ''جسارت'' کراچی سے ہوا، اس وقت جسارت کے ایڈیٹر عبدالکریم عابد صاحب تھے، جو دانشور صحافیوں میں ممتاز حیثیت رکھتے تھے۔ وہ ایک صوفیانہ مزاج رکھنے والے فرد تھے، انتہائی سادہ، لیکن ذہانت سے پُر، فکر میں پختگی، اور ہر موضوع پر لکھنے کے معاملے میں سارے ملک کے صحافیوں سے منفرد تھے۔ پڑھنے والے انکے مضامین اور اداریوں کا شدت سے انتظار کرتے تھے، سندھ کے خاص حالات کی وجہ سے، مجھ جیسے لکھنے والے کو آگے بڑھانے میں انہوں نے خاص دلچسپی لی۔ میں نے ۱۹۷۷ء تک یہ کوشش کی کہ عابد صاحب کے مضامین کو فائل میں محفوظ رکھا، انکے لکھے ہوئے مضامین کو وقتا فوقتا پڑھکر، ان سے اپنے لکھنے کے انداز اور طرز تحریر کو سنوارتا تھا، جب بھی میں کراچی جاتا تو ان کے گھر میں قیام کرتا تھا، گھر میں ایک کمرہ مہمانوں کیلئے مختص تھا، انکی گفتگو سے بھی کام کے نکتے ملتے تھے۔

جسارت میں ۱۹۷۱ء کے آخر میں انہوں نے محسوس کیا کہ ایڈیٹر کی حیثیت سے ان کا کام کرنا مشکل ہے تو وہ استعفیٰ دیکر گھر بیٹھ گئے، استعفیٰ کے دو اسباب تھے، ایک تو جماعت اسلامی نے مشرقی پاکستان میں فوج کا ساتھ دیکر بڑی سیاسی غلطی کی تھی، دوسرے یہ کہ، محمد صلاح الدین، جو بڑے صحافی تھے، ان کے ساتھ مختلف معاملات میں ان کا اختلاف تھا۔

استعفیٰ دینے کے بعد جماعت اسلامی کے ذمہ داروں نے بڑی مشکل سے انہیں ''جسارت'' میں مستقل طور پر مضمون لکھنے پر آمادہ کیا۔ ''جسارت'' کی بندش کے بعد وہ، عبدالقادر حسن صاحب کے ہفتہ وار رسالے ''افریشیا'' کے مدیر مقرر ہوئے، یہ رسالہ لاہور سے شایع ہوتا تھا۔ مجھے بھی انہوں نے ''افریشیا'' میں لکھنے پر آمادہ کیا، لیکن ہفتہ روزہ افریشیا بھی سال دیڑھ میں بند ہوگیا۔ اس کے بعد ۱۹۷۷ء تک عابد صاحب کے ساتھ میں نے مجیب الرحمان شامی صاحب کے رسالے ''لیل ونہار'' میں لکھنا شروع کیا۔

عبدالکریم عابد صاحب، جہاں علم ودانش میں ایک ممتاز شخصیت تھے، وہاں ان کی شخصیت میں درویشی کے اجزاء بھی موجود تھے۔ جس کا اندازہ درج ذیل واقعات سے لگایا جا سکتا ہے، موصوف کے والد صاحب حیدرآباد دکن میں کاروباری شخصیت تھے، وہ اپنے پیچھے کافی جائداد چھوڑ گئے، ان کی اولاد، جو حیدرآباد دکن میں رہتی تھی، انہوں نے یہ ساری جائداد ان کو دیدی، اور اپنے فرزند کو تاکید کردی کہ، میری موت کے بعد اپنی پھوپھی سے جائیداد میں حصیداری کا مطالبہ نہ کرنا۔

دوسرا واقعہ یہ ہے کہ عابد صاحب نے لاہور میں ایک عوامی نوعیت کی کالونی میں مکان لیا تھا، سلمان عابد صاحب جو ان کے فرزند ہیں، انہوں نے ان سے کہا کہ میرے پاس اتنے وسائل ہیں کہ میں اچھی جگہ بہتر مکان لینا چاہتا ہوں، عابد صاحب نے انہیں ایسا کرنے سے روک دیا۔

عابد صاحب اپنی عمر کے آخری ۲۲ سالوں میں گلے کے کینسر کے مرض میں مبتلا رہے، جماعت اسلامی پاکستان کے اس وقت کے ناظم نشر واشاعت چوہدری صفدر صاحب نے اپنے

دوستوں سے چندہ جمع کرکے، عابد صاحب کا لندن کے ہسپتال میں علاج کروانے کا انتظام کیا، سارا انتظام کرنے کے بعد انہوں نے عابد صاحب کو اس کی اطلاع دی، عابد صاحب نے ان کی یہ آفر قبول نہ کی اور کہا،''ملک کے غریب لوگوں کے پاس تو مقامی ہسپتال میں بھی اس قسم کی بیماریوں کے علاج کی سہولت اور وسائل موجود نہیں ہیں، اور میں لندن میں اپنا علاج کرواؤں، ایسا کرنا میرا دل گوارہ نہیں کرتا۔''

آج کی صحافت میں اس قسم کے لوگ ڈھونڈنے سے بھی نہیں ملتے۔

''جسارت'' میں عابد صاحب کے استعفیٰ کے بعد جسارت کے مدیر محمد صلاح الدین صاحب رہے، صلاح الدین موصوف اپنی ذات میں انجمن تھے، انتہائی متحرک، فعال، جرئت مند اور حمیت دین رکھنے والے۔ میں نے ۱۹۸۳ع کے شروع تک محترم صلاح الدین صاحب کے ساتھ کام کیا، جسارت کا دوبارہ اجراء بھٹو صاحب کی حکومت کے خاتمے اور ضیاء الحق صاحب کے برسراقتدار آنے پر ۱۹۷۷ع میں ہوا، صلاح الدین صاحب، ذوالفقار علی بھٹو اور پیپلز پارٹی کو ملک کیلئے بہت بڑا خطرہ سمجھتے تھے۔ اس لئے بھٹو اور پیپلز پارٹی سے دشمنی ان کے مزاج کا حصہ بن چکی تھی۔ اس کے علاوہ موصوف علاقائی مسائل پر لکھنے کے حامی نہیں تھے۔

۱۹۸۲ع میں میرا یہ ذہن بن چکا تھا کہ چھوٹے صوبوں بالخصوص سندھ کو مطمئن کرنے کیلئے اہل سندھ کے علاقائی مسائل کو اہمیت دینا ضروری ہے، اس موضوع پر میں نے ۱۹۸۲ع سے جسارت میں مضامین لکھنے شروع کئے، سندھ کے بارے میں میرے نئے موقف کی وجہ سے صلاح الدین صاحب، مضمون تو کسی نہ کسی طرح شایع کرتے رہے، لیکن آخر میں موصوف نے مجھے لکھا کہ، آئندہ آپکے مضامین شایع نہیں ہوں گے، اس لئے کہ لگتا ہے کہ آپ ''سندھو دیش'' تحریک سے مرعوب ہو چکے ہیں۔

محترم صلاح الدین صاحب نے سندھو دیش تحریک سے مرعوب ہونے کی جو بات خط میں لکھی، ان کی یہ بات تو صحیح نہیں تھی، البتہ اس کو میری حکمت عملی کی غلطی کہا جا سکتا ہے، لیکن الحمدللہ، میں جلد ہی علاقائی مسائل کی سوچ سے بلند ہو کر، سندھی زبان میں اسلام کے علمی اور فکری کام کی طرف آ گیا، اور میری اس حکمت عملی نے نظریاتی کام میں مجھے بہت فائدہ پہنچایا، اسکے بعد جلد ہی محمد صلاح الدین صاحب اور محمود اعظم فاروقی صاحب (جو جسارت کی انتظامیہ کے نگران اعلیٰ تھے) ان کے درمیاں اختلافات بڑھ گئے۔ صلاح الدین صاحب پیپلز پارٹی سے اختلاف کے معاملے میں بہت آگے بڑھ چکے تھے، جبکہ، جماعتِ اسلامی کراچی کی قیادت، جس میں محمود اعظم فاروقی صاحب اور پروفیسر عبدالغفور احمد صاحب شامل تھے، انکا نقطۂ نگاہ یہ تھا کہ پیپلز پارٹی کی اتنی مخالفت صحیح نہیں ہے، کیونکہ یہ قومی نوعیت کی پارٹی ہے، قوم پرستی کی تحریکوں کے مقابلے میں پیپلز پارٹی ملک کیلئے غنیمت ہے، اس اختلاف کی وجہ سے محترم صلاح الدین صاحب کو جسارت کو چھوڑنا پڑا، اور اس کے بعد جلد ہی موصوف نے ''تکبیر'' کے نام سے ایک ہفتہ وار رسالہ جاری کیا، جو بہت ہی مقبول ہوا۔

جسارت کی انتظامیہ نے عبدالکریم عابد صاحب کو لاہور سے بلا کر مدیر کی حیثیت سے انکی خدمات حاصل کیں۔

محمد صلاح الدین صاحب نے اختلافِ رائے کے باوجود مجھے تکبیر میں لکھنے کے لئے کہا، لیکن سندھی زبان میں علمی کام کی وجہ سے میں نے ان سے تکبیر میں لکھنے سے معذرت کر لی۔ عبدالکریم عابد صاحب کے جسارت میں دوبارہ آنے کی وجہ سے، میں نے سال بھر مزید، ''جسارت'' میں کام کیا، عبدالکریم عابد صاحب نے میری نئی اردو کتاب ''پاکستان میں قومیتوں کے مسائل اور ان کا حل'' میں شامل کئی مضامین جسارت میں شایع کئے۔

محمد صلاح الدین صاحب کی شخصیت میں اخلاص، جذبۂ جہاد اور حمیتِ دین کے اجزاء کوٹ کوٹ کر بھرے ہوئے تھے۔ اس وقت کے صدر ضیاء الحق سے قریبی تعلقات ہونے کے باوجود انہوں نے ان سے کوئی مالی فائدہ حاصل نہیں کیا۔ اس کا اندازہ اس بات سے لگایا جا سکتا ہے کہ، ''جسارت'' میں شایع شدہ میرے مضامیں میں سے کچھ مضامین انہیں بہت پسند آئے، انہوں نے کہا کہ آپ ان مضامین کو کتابی صورت میں شایع کریں۔ اس کے اخراجات میں ادا کرونگا۔ میں نے کتاب شایع کردی، لیکن موصوف پیسے نہ دے سکے۔ جسارت کے ایک قاری جو ان کے دوست بھی تھے، میں صلاح الدین صاحب سے ملنے گیا تو موصوف نے اپنے دوست قاری سے کہا کہ انہوں نے میرے کہنے پر کتاب شایع کی ہے، ان کی کچھ مدد کریں۔

''ایم آر ڈی'' تحریک نے پنجاب کے علمی حلقے میں پاکستان کے مستقبل کے متعلق بڑی تشویش پیدا کردی تھی، ڈاکٹر اسرار احمد صاحب ''محاضرات قرآنی'' کے نام سے، سال میں دو تین دنوں کیلئے لاہور میں پروگرام رکھتے تھے، انہوں نے ۱۹۸۳ع کے آخر میں ایک دن کا پروگرام سندھ کے حوالے سے رکھا، سندھ سے موصوف نے محمد صلاح الدین صاحب، مجھے، ''الشریعت'' سندھی کے مدیر مولانا عبدالوھاب چاچڑ صاحب اور آغا نور محمد پٹھان صاحب، جو (اسلامی جمعیۃ

طلبہ سندھ کے معتمد یا جنرل سیکریٹری رہ چکے تھے) ہم تینوں کو انہوں نے دعوت دیکر بلایا، اس پروگرام میں آغا نور محمد پٹھان صاحب نے اپنی تقریر میں محمد صلاح الدین صاحب پر سخت تنقید کی، کہ موصوف سندھ دشمنی میں بہت آگے نکل چکے ہیں، حالانکہ انہیں سندھ سے ہونے والی زیادتیوں پر سندھ کا ساتھ دینا چاہیئے تھا۔ آغا صاحب کی تنقید پر محمد صلاح الدین صاحب نے مجھے خط لکھا کہ، آغا نور محمد صاحب مجھ سے ناراض ہیں، آپ میری طرف سے ان سے معافی طلب کریں، کسی دیندار نوجوان کو ناراض کرنا، میرے لئے باعث اذیت ہے۔

غالباً ۱۹۸۸ء کا ذکر ہے کہ، محترم صلاح الدین صاحب اور ڈاکٹر اسرار احمد صاحب کے درمیاں پیپلز پارٹی، عورت کی سربراہی اور کچھ دوسرے مسائل پر سخت اختلافات پیدا ہوگئے۔ محترم محمد صلاح الدین صاحب نے ''تکبیر'' میں محترم ڈاکٹر اسرار احمد صاحب پر سخت تنقید کی، اور ان مسائل پر اپنے موقف کو شد ومد سے پیش کیا، اس کے جواب میں ڈاکٹر اسرار احمد صاحب نے تفصیلی مضمون لکھا، جو ماہنامہ ''میثاق'' کا پورا نمبر بن گیا، ڈاکٹر صاحب کی طرف سے تنقید میں جو لہجہ اختیار کیا گیا تھا، وہ غیر معمولی طور پر سخت تھا، اس بحث کی وجہ سے اسلام دوست علمی حلقے میں کافی تشویش پیدا ہوگئی۔ محترم صلاح الدین صاحب نے ''تکبیر'' میں اعلان کیا کہ ڈاکٹر اسرار احمد صاحب کے مضمون کے جواب میں تفصیلی مضمون ''تکبیر'' کے آئندہ شمارے میں ملاحظہ فرمائیے۔ میں نے محترم صلاح الدین صاحب کو خط لکھا کہ آپ برائے کرم صبر سے کام لیں، اس مضمون کو شایع کرنے کی بجائے یہ نوٹ شایع کریں کہ، ''ڈاکٹر اسرار احمد صاحب ایک فاضل شخصیت ہیں، اور دین کی بہت خدمت کررہے ہیں، میں موصوف سے بحث کرنا مناسب نہیں سمجھتا، ڈاکٹر صاحب نے میرے بارے میں جو زبان اختیار کی ہے، اس کے لئے میں انہیں دل سے معاف کرتا ہوں۔''

محترم صلاح الدین صاحب نے میرے خط کا خیر مقدم کیا اور اس خط کا حوالہ دیکر ''تکبیر'' میں لکھا کہ، ''میں ڈاکٹر اسرار احمد صاحب جیسی علمی شخصیت سے بحث میں پڑنا نہیں چاہتا، تکبیر میں اعلان شدہ مضمون شایع نہیں کیا جارہا، اس کے لئے قارئین سے معذرت خواہ ہوں۔''

بڑے لوگوں کی یہ بڑی باتیں ہیں، جس کی آجکل کے لکھنے والوں سے توقع کرنا مشکل ہے۔

محمد صلاح الدین صاحب ہفتہ روزہ تکبیر میں ایم کیو ایم کی ملک دشمن سرگرمیوں کے خلاف سخت لکھتے تھے، یہ وہ دور تھا، جب ایم کیو ایم خوف اور دہشتگردی کی علامت بن چکی تھی، اس وقت ان کو سخت تنقید کا نشانہ بنانا اور ان کے پول کھولنا، یہ محمد صلاح الدین جیسے مجاہد کا ہی کارنامہ تھا، ایم کیو ایم نے اسی جرم میں انہیں شہید کیا۔

محمد صلاح الدین صاحب نے روزانہ اخبار کے اجراء کا منصوبہ بنایا تھا، جسے ان کی شہادت کے بعد، انکی اکلوتی بیٹی کے شوہر رفیق افغان صاحب نے، ''امت'' اخبار کی صورت میں جاری کیا۔

۱۹۸۳ء کے آخر، یا ۱۹۸۴ء کے شروع میں میں نے جسارت کی ملازمت چھوڑ دی، ''جنگ'' کے بانی میر خلیل الرحمٰن صاحب نے مجھے ''جنگ'' میں لکھنے کیلئے خط لکھا، میں نے جنگ میں اعزازی طور پر لکھنا شروع کیا، تاکہ قومی صحافت کے ساتھ کسی نہ کسی طرح میرا تعلق قائم رہے۔

لیکن میری سرگرمیوں کا اصل ہدف سندھی زبان میں علمی اور فکری لٹریچر رہا، چونکہ ۱۹۸۴ء میں میرا ایک نقشبندی سلسلے کے بزرگ سے تعلق قائم ہو چکا تھا اور ذہنی طور پر میں تصوف کی فکر کو اختیار کر چکا تھا، اسلئے جنگ میں قومی مسائل پر لکھنے کے ساتھ ساتھ جدید دور میں اسلامی فکر کی پیشکش کے موضوع پر میرے کافی مضامین شایع ہوئے، جو بعد میں ''جدید دوَر میں اسلامی فکر''، ''پاکستان میں اصلاح کا لائحہ عمل'' اور ''قومی تشکیل نو'' کے ناموں سے کتابی صورت میں شایع ہوئے۔

فکری اعتبار سے میں نے جو توازن اور وسعت عبدالکریم عابد صاحب کی شخصیت میں دیکھی، ایسی وسعتِ فکری، کسی اور میں نظر نہیں آئی۔ ایک طرف تو وہ آخر وقت تک جماعت اسلامی کے اخبارات سے وابستہ رہے، دوسری طرف وہ لاہور کے سیکیولر قسم کے اخبارات میں بھی مضامین لکھتے رہے، جن میں بڑی حکمت کے ساتھ اپنا موقف پیش کرتے رہے، اسکے ساتھ ساتھ انہیں جماعت اسلامی کی فکر اور سیاسی حکمتِ عملی میں موجود غلطیوں کا بھی اندازہ تھا اور تجزیہ کرنے کا بھی پورا شعور حاصل تھا، ایک دفعہ کہنے لگے کہ ''مولوی بیچارہ دائراتی خول میں بند ہوگیا ہے، اسلئے اسکی سوچ میں محدودیت آ گئی ہے، اور وہ معاشرے میں متنازع بن گیا ہے۔ یہی سوچ

کی محدودیت جماعت اسلامی میں بھی پیدا ہوچکی ہے، اسی لئے جماعت کی، محدود دائرے سے بلند ہوکر سوچنے کی صلاحیت متاثر ہو چکی ہے، جماعتی دائروں میں محصور ہوجانا بہت بڑے نقصان کا باعث بنتا ہے۔

میرا اردو ڈائجسٹ کے مدیر الطاف حسین قریشی اور مجیب الرحمٰن شامی صاحب کے ساتھ بھی کافی تعلق رہا، پاکستان میں سوشلزم کے نام پر ابھرنے والی تحریک کی روک تھام میں ان دونوں صاحبان نے اہم کردار ادا کیا تھا۔ محمد صلاح الدین صاحب۔ الطاف حسین قریشی صاحب اور شامی صاحب، یہ تینوں ممتاز لکھنے والے دوستی کے گہرے رشتے میں بھی منسلک تھے۔ ان تینوں کے اس وقت کے صدر ضیاء الحق صاحب سے گہرے مراسم رہے، بھٹو صاحب کے دور حکومت میں یہ تینوں سخت تکلیفوں میں رہے۔

میں نے ''جسارت'' میں ذوالفقارعلی بھٹو صاحب کی حکومت اور پالیسیوں کے خلاف سخت لکھا، اور مسلسل لکھا۔ ''ذوالفقارعلی بھٹو اور ان کے عروج وزوال کی کہانی'' کے نام سے ایک کتاب بھی لکھی، جو بہت مقبول ہوئی، لیکن بعد میں محسوس ہوا کہ اس معاملے میں توازن اور اعتدال کا دامن اگر تھامے رکھتا تو اچھا تھا۔ بھٹو صاحب کی شخصیت میں کچھ اوصاف ایسے تھے جنہیں کسی صورت نظر انداز نہیں کیا جا سکتا۔

انہوں نے لاہور میں عالم اسلام کے اس وقت کے سربراہوں کی کانفرنس بلائی، شاہ فیصل کے تعاون سے پاکستان کو ایٹمی قوت بنانے کا کارنامہ سرانجام دیا، حالانکہ امریکہ نے اسی وقت انہیں دھمکی دی تھی کہ وہ ایسی جسارت نہ کرے، ورنہ اسے موت کا منہ دیکھنا پڑیگا، لیکن بھٹو صاحب نے ڈاکٹر عبدالقدیر خان صاحب کو محض ان کے خط لکھنے پر باہر سے بلا کر اس کام پر لگادیا۔ قادیانیوں کو غیرمسلم قرار دینے میں بھٹو صاحب نے اہم کردار ادا کیا۔ جمعے کے دن عام تعطیل بھی بھٹو صاحب کے دور حکومت میں ہوئی۔

عبدالکریم عابد صاحب کا کہنا تھا کہ مجھے ڈر تھا کہ کہیں امریکہ بھٹو صاحب کے ان کاموں کی وجہ سے انہیں ختم نہ کروا دے، اس لئے میری یہ کوشش رہی کہ جماعت اسلامی (جو اپنی تنظیمی قوت کی وجہ سے اس وقت حزب اختلاف کی سب سے بڑی پارٹی تھی) بھٹو صاحب کے خلاف تحریک میں شامل نہ ہو، کیونکہ اسکا نتیجہ مارشل لاء کی صورت میں ہی ظاہر ہوسکتا تھا، اس طرح بھٹو صاحب کا تو جو حشر ہوگا، وہ ہوگا ہی، ملک کی سالمیت کو اس کا بڑا نقصان ہوگا۔

اس وقت بھٹو صاحب کی شخصیت کے ان پہلوؤں پر نظر نہ ہونے کی وجہ سے میرے مضامین میں بھٹو دشمنی کا رنگ غالب رہا، بعد میں احساس ہوا کہ ایک اچھے لکھنے والے کو ہر اہم معاملہ میں سارے پہلوؤں کو سامنے رکھکر، تجزیہ کرنا چاہئے اور اعتدال وتوازن کو قائم رکھنا چاہئے۔

سوال: حیدرآباد میں رہتے ہوئے، سندھ کے بڑے محقق ڈاکٹر نبی بخش خان بلوچ صاحب کے ساتھ آپکی ملاقاتیں تو ضرور ہوئی ہونگی، ان کو آپ نے کیسا پایا؟

جواب: ڈاکٹر بلوچ صاحب سندھ کی تاریخ، سندھی زبان، لوک ادب اور لطیفیات کے سندھ کے سب سے بڑے ماہر تھے، ان کا ادبی اور تحقیقی کام ایسا ہے جس کی کوئی مثال نہیں ملتی۔ ڈاکٹر صاحب سے ملاقاتیں ہوتی تھیں، ہر ملاقات میں ڈاکٹر صاحب مجھے کہتے تھے، موسیٰ صاحب! آپ جس محاذ پر کام کر رہے ہیں، وہ سب سے بڑا محاذ ہے، آپ بہت بڑا جہاد کر رہے ہیں، محمد ابراہیم جویو صاحب، جی ایم سید اور صوبھو گیان چندانی نے پوری زندگی کام کر کے ہماری ذہین نسلوں کو اپنے تاریخی اور تہذیبی ورثے سے بالکل دور کردیا ہے، آپ ان کی فکر کی رد میں اور اسلام (کی اصل روح سے آشنائی) کیلئے جس انداز میں کام کررہے ہیں، میرے دل میں اس کام کی بہت قدر ہے۔

کبھی، کبھی ڈاکٹر صاحب فون کرکے کہتے تھے کہ، بیداری رسالے کیلئے آپکی امانت میرے پاس پڑی ہوئی ہے، کوئی آدمی بھیج کر اپنی امانت منگوالیں۔ وہ امانت، بیداری کیلئے چندے کی رقم ہوتی تھی، جو کبھی ایک ہزار تو کبھی دو، چار ہزار روپے ہوتے تھے۔

بظاہر محسوس ہوتا تھا کہ ڈاکٹر صاحب محض محقق، ادیب اور تعلیمی ماہر ہیں، فکری اور نظریاتی طور پر سندھ میں جو کشمکش جاری ہے، اس میں وہ غیر جانبدار ہیں، لیکن میری ڈاکٹر صاحب سے جب بھی ملاقات ہوئی، میں نے ڈاکٹر صاحب میں حمیت دین محسوس کی، اس سلسلے میں زیادہ تفصیل میں نے ڈاکٹر صاحب کے انتقال کے موقعے پر بیداری سندھی میں لکھے ہوئے اپنے تفصیلی مضمون میں پیش کی ہے۔

مسلمانوں کے چار طبقات

آج مسلمانوں کو دینی اور اعتقادی بیداری کی سخت ضرورت ہے، اس وقت ان کی عمومی تعداد ایک ہزار پانچ سوملین سے متجاوز ہے، ان کے پاس بڑے بڑے ممالک بھی ہیں اور حکومتیں بھی، ان کے پاس عالمی تنظیمیں بھی ہیں اور بین الاقوامی یونیورسٹیاں بھی، عالمی برادری میں ان کا ایک مقام ہے، اور ان کو وہاں کی رکنیت بھی حاصل ہے، وہ فطری وسائل وذخائر سے مالا مال بھی ہیں، اور وسیع جغرافیائی رقبہ بھی ان کے پاس ہے، ان کی ایک بڑی تعداد تعلیم یافتہ بھی ہے، اور علوم ومعارف میں ممتاز بھی، اور وہ معاشرتی اور حکومتی فیصلوں میں اہم اور تنقیدی رائے بھی رکھتے ہیں۔

اسی طرح ان کے پاس ایسے علمائے اسلام اور مصلحین قوم وملت بھی ہیں، جو حقیقت اسلام کی ترجمانی کرتے ہیں، اور اچھی تربیت سے آراستہ ہونے اور انسانی زندگی کو علم وحکمت کے قالب میں ڈھالنے کی کوشش کرتے ہیں، اور پوری امت کو ایک جان دوقالب ہونے کی تلقین کرتے ہیں، کیونکہ یہ امت زندگی اور معاشرہ کے ہر شعبہ میں اعتدال کی نمائندہ ہیں، اور شرانگیز افراد کے خلاف سیسہ پلائی ہوئی دیوار ہے، اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: "**وکذالک جعلنا کم امتہ وسطا لتکونوا شھداء علی الناس ویکون الرسول علیکم شھیدا**" (بقرہ: ۱۴۳) (اور اسی طرح ہم نے تم کو ایک معتدل امت بنایا، تاکہ تم لوگوں پر گواہ بنو اور رسول تمہارے اوپر)۔

لیکن اس وقت کا المیہ یہ ہے کہ امت مسلمہ اور اس کے افراد نہ ایک رائے رکھتے ہیں، اور نہ ایک صف میں متحد ہیں، بلکہ حقیقت حال یہ ہے کہ وہ پہلے سے ہی مختلف انواع واصناف میں منقسم ہیں، اور حالیہ واقعات کے تناظر میں مسلمانوں میں ایک صنف اور پیدا ہوگئی ہے، وہ خانماں برباد افراد کی ہے، اس کا سلسلہ خاص طور سے خونریز واقعات، اور ظالمانہ تشدد کے بعد ان کی نسل کشی کے ذریعہ شروع ہوا، ایسا محسوس ہوتا ہے کہ مسلمانوں کے خلاف کوئی خاص پلاننگ چل رہی ہو، وہ مسلمانوں کی وحدت کو پارہ پارہ کرنا چاہتے ہیں، اور ان کو جانوروں سے بھی زیادہ بے حیثیت کرنا چاہتے ہیں، تاکہ مسلمان کسی انسانی بلندی کو نہ حاصل کرسکیں، اور ان کی اجتماعی نسل کشی ہو سکے اور دین اسلام اور اس کی بنیادی تعلیمات سے ان کو محروم کر دیا جائے، اس کے لیے نئے نئے سازشی طریقے استعمال کیے جارہے ہیں، کبھی ڈرا دھمکا کر، اور کبھی ان کا اقتصادی ومعاشرتی بائیکاٹ کرکے، اس لیے مسلم معاشرہ میں متعدد قسم کے افراد ہیں:

۱۔ پہلا طبقہ ان علماء، دعاۃ اور مصلحین کا جو لوگوں کو سیرت وکردار کی روشنی میں اسلام کی دعوت دیتے ہیں، اس کی سب سے عمدہ مثال صحابہ کرامؓ ہیں، جو رسول اللہ ﷺ کے راستہ پر چلے، اور ہر چھوٹی بڑی چیز میں آپ ﷺ کے طریقے کو اختیار کیا، قرآن میں انہیں لوگوں کے متعلق آیا ہے:

"**تراھم رکعا سجدا یبتغون فضلا من اللہ ورضوانا، سیماھم فی وجوھھم من اثر السجود.**" (فتح: ۲۹) (تم ان کو رکوع وسجدہ میں دیکھو گے، وہ اللہ کا فضل اور اس کی خوشنودی کے طالب ہیں، ان کی پیشانی پر سجدہ کے اثرات نظر آتے ہیں)۔

ان کی زندگی ایمان واخلاص، توکل وپرہیز گاری، صبر وشکر، عدل وحکمت، جود وسخاء، حلم وبردباری، عفو ودرگزر، تواضع وانکساری، ایثار وقربانی، اخوت ومحبت، زہد وقناعت ہر قسم کے حقوق ادا کرنے، حسن معاملات، بھلائی کی وصیت کرنے، اور حسن ظن رکھنے، مساوات وغم خواری، نصیحت وامانت کی سچی آئینہ دار تھی، اس طرح کی تمام ایمانی صفات مسلمانوں کے اس اہل علم ودین کے طبقہ میں پائی جاتی تھیں، وہ اللہ والے تھے، اور لوگوں کو ایمان باللہ والرسول ﷺ کی زندگی سکھاتے تھے، ان کے مراکز ومجالس سیکھنے والے مسلمانوں سے بھرے ہوتے تھے، وہ ان سے دین پر مکمل عمل کرنے پر بیعت کرتے تھے، اللہ تعالیٰ نے ہر زمان ومکان میں ان کی مکمل حفاظت فرمائی ہے، اور ان کی سیرتیں ہمارے سامنے ہیں۔

۲۔ دوسرا طبقہ: ان علمائے دین کا ہے، جو تعلیم وتربیت کے راستہ سے اللہ کے پیغام کو لوگوں تک پہنچانے کا اہتمام کرتے ہیں، وہ علمائے دین کے نام سے مشہور ہیں، وہ لوگوں کو زندگی کی حقیقت اور اس دنیا میں اس کا مقصد تخلیق بیان کرتے ہیں، اور اخروی زندگی اختیار کرنے کی تلقین کرتے ہیں، بیشک علماء ومعلمین اور تعلیم وتربیت کے میدان میں سرگرم عمل اور اللہ کی دعوت کو پھیلانے والا یہ طبقہ اللہ کا محبوب ہوتا ہے، اور اللہ نے اس طبقہ کو وارثین انبیاء کا مقام عطا فرمایا ہے، رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ''علماء انبیاء کے وارث ہیں، اور انبیاء دینار ودرہم کا وارث نہیں بناتے، بلکہ علم کا وارث بناتے ہیں، جس نے اس کو حاصل کیا، اس نے بڑی چیز حاصل کی۔''

تعلیم وتربیت کے مراکز اس طبقہ کی توجہ کا مرکز ہوتے ہیں، وہ اعلیٰ معیار پر علم ومعرفت کے مدارس اور اسلامی یونیورسٹیاں قائم کرنے میں کوئی کسر نہیں چھوڑتے ہیں، اس کے تعلیمی وتربیتی

نصاب کو پڑھ کر بہت سے ایسے افراد تیار ہوتے ہیں، جو اعتدال اور جامعیت کا نمونہ ہوتے ہیں، وہ تعلیم وتربیت کی ذمہ داری سنبھالتے ہیں، تمام ومعاملات وحالت میں علم دین کو توازن کے ساتھ پھیلاتے ہیں، اس کے باوجود اسلام مخالف طاقتیں معاشرۂ انسانی سے ان علمائے ربانیین کی قوت وتاثیر کو ختم کرنا چاہتی ہیں، اور معاشرہ میں ان کے اثر ورسوخ کو کمزور کرنے میں کوئی کسر نہیں چھوڑتی، وہ تو صرف اس سے خوش ہوتی ہیں کہ نوجوان مسلمان تعلیم وتربیت سے یکسر خالی ہوں، لیکن اللہ تبارک وتعالیٰ نے ناکامی ونامرادی خود ان طاقتوں کے مقدر میں لکھ دی ہے، کیونکہ انہیں یہ معلوم ہے کہ اگر مسلمان علمی ہتھیار سے خالی ہوں گے تو ان کی ایمانی ہیبت کو ختم کرنا اور اس کی قوت تاثیر کو زائل کرنا، جس سے ہر وہ موقع پر دوسروں سے ممتاز ہوتے ہیں، اور اسلام اور اس کی تعلیمات کے خلاف رجحانات کو تبدیل کرنا آسان ہوجائے گا، ان علماء کا مشن ہے کہ تمام مسلمانوں کو علم نافع حاصل کرنے پر بہت زور دیتے ہیں، اور ان کے سامنے علم حاصل کرنے کے فضائل بیان کرتے ہیں، اور یہ بتاتے ہیں کہ فرشتے اپنے پروں کو طالبان علوم نبوت کے لیے بچھا دیتے ہیں، اس کام سے خوش ہوکر جس میں وہ مشغول ہیں، ان کا یقین ہے کہ آسمان وزمین کے انعامات تعلیم اور دینی رہنمائی کی انجام دینے میں مضمر ہیں، اس میں کوئی شک نہیں کہ یہ ممتاز طبقہ مسلم معاشرہ کو ایسی خصوصیت سے نوازتا ہے، جس کی برابری کسی چیز میں نہیں، اللہ کا ارشاد ہے: **"یرفع اللہ الذین آمنوا منکم والذین اوتوا العلم درجات"** (مجادلہ:۱۱) (اللہ تعالیٰ تم میں سے ایمان والوں کو اور اہل علم کو بلند درجات عطا فرماتا ہے)، یہ اللہ کا قانون ہے کہ اس طبقہ علماء کی سرگرمیوں کو روکنے میں ان کی کوششیں کبھی کامیاب نہیں ہوں گی، انشاء اللہ تعالیٰ۔

۳۔ تیسرا طبقہ: ان عام مسلمانوں کا ہے جو مسلم معاشرہ اور انسانی مجموعہ کے مابین زندگی گذارتے ہیں، وہ اکثر حالات میں اسلام کی سنی اور دیکھی ہوئی معلومات پر اکتفاء کرتے ہیں، مزید اسلام اور اس کی تعلیمات کو جاننے کی بالکل کوشش نہیں کرتے، ان میں ایک تعداد ایسے لوگوں کی بھی ہوتی ہے، جو دینی احکام کی واقفیت میں اضافہ کی سچی طلب رکھتے ہیں، لہٰذا وہ علماء کا احترام کرتے ہیں، اور وقتاً فوقتاً ان کی مجلسوں میں حاضر ہوتے ہیں، اور دینی تربیت کی بنیاد پر ان سے تعلق رکھتے ہیں، اور وہ کوشش کرتے ہیں کہ جتنا انہوں نے علم سیکھا ہے، اس کی روشنی میں اسلام کی نمائندگی کریں، کبھی کبھی ان کا دینی عمل بعض ظاہری شکل پر ہی منحصر ہوتا ہے، ان کے ذہن وخیال میں یہ بات نہیں آتی کہ اللہ اور اس کے رسول ﷺ کے اس پر کیا حقوق عائد ہوتے ہیں، اسی طرح سے بندہ اور مالک کے حقوق، اور وہ نفلی کام اور دینی شعائر کی تعظیم کو کوئی اہمیت نہیں دیتے، بلکہ وہ ایک خاص طرز کی زندگی پر اکتفا کرتے ہیں اور اس سے اوپر کسی بات کو نہیں سمجھتے۔

۴۔ چوتھا طبقہ: ان پڑھوں اور امی افراد کا ہے، جو ایسے ماحول میں زندگی گذارتے ہیں، جہاں کے لوگ چند دینی رسومات ہی کو دین سمجھتے ہیں، اور اپنی دینی واخلاقی ذمہ داریوں سے بالکل لاشعور ہوتے ہیں، ان کی صورتحال ان طبقات سے مختلف نہیں ہے، جو تمام انسانی صفات سے آزاد ہوتے ہیں، بلاشبہ یہ طبقہ صرف لفظ اسلام کے ساتھ زندگی گذارتا ہے، اور وہ ایسے کام کرتا ہے، جن کا انسانیت سے ذرہ برابر بھی تعلق نہیں ہوتا، انسانی قدروں کا شعور بھی ان کے اندر نہیں ہوتا، اور وہ ان گناہوں میں ملوث ہوتے ہیں، جو اللہ اور اس کے رسول ﷺ کی ناراضگی کا سبب بنتے ہیں۔

بلاشبہ علم دین سے دوری، اور شریعت اسلامی سے ناواقفیت ہی ایسے افراد کو غیرشرعی زندگی گذارنے پر آمادہ کرتی ہے، چنانچہ وہ ایسی زندگی گزارتے ہیں، جو جانوروں سے بھی بدتر ہوتی ہے، اور اللہ کے غضب کو بھڑکاتی ہے، پھر قہر الٰہی کا نزول ہوتا ہے، کہنے والے نے صحیح کہا ہے:
''گناہ مصیبتوں کا سبب بنتے ہیں۔''

آج کل جو انسانی حوادث، واقعات، مختلف شکلوں میں رونما ہورہے ہیں، ان کے پیچھے معصیتوں کا اثر نظر آتا ہے، یہ ایک طے شدہ حقیقت ہے کہ جب بھی انسان اپنے اصل طریقے سے ہٹا اور اس نے معصیت کا رخ کیا ہے، اور نفس کا مطیع وفرمانبردار بنا اور اپنی باگ ڈور شیاطین انس وجن کے سپرد کردی ہے تو اس کو فساد وہلاکت اور خونریزی اور معصوم انسانوں کے قتل وغارت گری کا سامنا کرنا ہے، آج ہمارے سامنے برما کے ان روہنگیائی مسلمانوں کی حرمت کی بڑی سطح پر پامالی کا مسئلہ ہے، جو اجتماعی نسل کشی کے شکار ہوئے، ہزاروں روہنگیائی مسلمان قتل کیے گئے، اور جلائے گئے، اور اب ہزاروں جلاوطنی کی زندگی گذار رہے ہیں۔

آج ہمارے سامنے ایک سوال ہے، جو جواب کا متقاضی ہے کہ آخر کیوں مسلمان ہی ہر ملک میں اور ہر جگہ ان وحشیانہ اور مظلومانہ کارروائیوں کا نشانہ بن رہے ہیں، آخر اس کی اصل وجہ کیا ہے؟ میں امید کرتا ہوں کہ یہ حقیر سوال علماء امت قومی لیڈوں کے کانوں سے ضرور ٹکرائے گا، اور وہ اس کا جواب قرآن وسنت کی روشنی میں دیں گے اور اللہ نیکوکاروں کے اجر کا ضائع نہیں کرتا۔

مصنوعی ذہانت کی ٹیکنالوجی

اور اس کے اثرات و نتائج

مستقبل کے بارے میں کوئی بھی بات پورے یقین سے کہنا بہت دشوار ثابت ہوتا ہے، اس لیے بہتر ہوگا کہ ہم ماضی کی توضیح سے آغاز کریں۔ انیسویں صدی کے حوالے سے تاریخ کو بیان اور واضح کرنے کا بہترین طریقہ کیا ہوسکتا ہے؟ آئیے، لبرل ڈیموکریسی کے ذریعے ابتدا کرتے ہیں۔ فرانسیسیوں نے اپنے بادشاہ کو پھانسی دے دی ہے اور جان لاک کے مٹھی بھر جاں نثاروں اور معتقدین نے بحر اوقیانوس کے اُس پار ایک سادہ لوح جمہوریہ قائم کی ہے۔ برطانوی سرزمین پر جان اسٹیوارٹ مل عمدگی سے لبرل ڈیموکریسی اور انسانی وقار کا دفاع کر رہا ہے۔ ایسا دکھائی دے رہا ہے، جیسے بادشاہت کے دن گنے جا چکے ہیں۔ اس کے بعد آزاد منڈی کی معیشت کا انقلاب برپا ہو رہا ہے، جس کے بڑے ستاروں میں ٹامس مالتھس اور ڈیوڈ ریکارڈو شامل ہیں۔

انیسویں صدی مغربی سلطنت اور نو آبادیات کے حوالے سے نقطۂ عروج کا زمانہ ہے۔ اب مکمل جنگ کا دور شروع ہو رہا ہے۔ سیاسی قوت کی حیثیت سے مذہب کے زوال کا زمانہ شروع ہو رہا ہے اور اُس کی جگہ لینے کے لیے قومیت کا رجحان پوری طرح تیار ہے۔ اگر بغور جائزہ لیا جائے تو یہی دور صنفی بنیاد پر مساوات کا اصول اپنانے کا بھی ہے۔ خواتین اپنے لیے برابری کا درجہ چاہتی ہیں، اور مطالبہ کر رہی ہیں کہ انہیں ووٹ ڈالنے کا حق دیا جائے۔ نیوزی لینڈ خواتین کو ووٹ کا حق دینے والا پہلا ملک بن جاتا ہے۔ برطانیہ میں غلامی کو غیر قانونی قرار دیا جاتا ہے اور امریکا کے علاوہ روس میں بھی غلاموں کو آزاد کرنے کا عمل شروع ہو جاتا ہے۔

انیسویں صدی بنیادی طور پر جمہوریت اور سرمایہ دارانہ نظام کے عروج، قوم پرستی کے طلوع ہونے، صنفی مساوات کے قائم ہونے، نو آبادیات کے قیام اور مکمل و ہمہ گیر جنگ کے چھڑنے سے عبارت ہے۔ ان میں سے ہر معاملہ اپنی جگہ مکمل اور انوکھا ہے اور ساتھ ہی ساتھ ہزاروں کتابوں کو جنم دینے کا وسیلہ بھی بنتا ہے۔

آج جائزہ لیجیے تو یہ سب کچھ پس منظر میں دکھائی دیتا ہے۔ ان میں سے کوئی بھی معاملہ

انیسویں صدی کی نمایاں ترین خصوصیت کا درجہ نہیں رکھتا تھا۔ تو پھر؟ انیسویں صدی اگر حقیقی مفہوم میں یاد رکھی جائے گی تو اصلاً صنعتی انقلاب کے حوالے سے۔ اگر صنعتی انقلاب رونما نہ ہوتا تو متوسط طبقے کا وجود ممکن نہ ہوا ہوتا اور اگر متوسط طبقہ نہ ہوتا تو جمہوریت کی راہ ہموار نہ ہوئی ہوتی!

سرمایہ دارانہ نظام کوئی انقلاب برپا کرنے میں کامیاب نہیں ہو پاتا، کیونکہ بیشتر زرعی معیشتیں اس کی ضرورت ہی محسوس نہیں کرتیں۔ غیر معمولی سطح کی نو آبادیات کی ضرورت بھی نہیں پڑتی، کیونکہ صنعتی ڈھانچا اتنا وسیع ہو ہی نہیں سکا ہے کہ خام مال کی بڑے پیمانے پر ضرورت محسوس کرے۔ حقیقت یہ ہے کہ صنعتی ڈھانچا اتنا پروان چڑھایا ہی نہیں جا سکا ہے کہ ہمہ گیر نوعیت کی جنگ کی راہ ہموار ہو۔ معیشت کو نئے خطوط پر استوار کرنا ممکن ہی نہیں بنایا جا سکا، کیونکہ بیشتر معیشتیں اب تک زرعی ماڈل پر کام کر رہی ہیں۔ غلامی کا مکمل خاتمہ یقینی بنایا جا سکا ہے نہ خواتین کے حقوق سے متعلق کوئی بڑی تحریک سر اٹھانے کے قابل ہو سکی ہے۔

اس دور کے بنیادی اور وسیع پیمانے کے اثرات کے حامل عوامل میں بھاپ کا انجن، ریلوے، بجلی اور جراثیم کا نظریہ نمایاں ہیں۔ ان چاروں کی مدد سے جو غیر معمولی نوعیت کی تبدیلیاں رونما ہوئیں، ان کے بغیر بہت کچھ زیادہ اہمیت کا حامل نہ ہو پاتا اور ایسا لگتا کہ معاملات ازمنۂ وسطیٰ کے مانند ہیں۔ ۱۸۰۰ عیسوی میں کوئی نہیں جانتا تھا کہ نئی صدی کی تقدیر کا فیصلہ ٹامس نیوکامین نے ۹ دہائیوں پہلے بھاپ انجن ایجاد کرکے کر دیا تھا۔ تاریخ دان اور خارجہ پالیسی کے ماہرین شاید یہ بات سننا پسند نہ کریں۔ مگر خیر، جو کچھ بھی وہ انیسویں صدی کے حوالے سے پڑھتے اور پڑھاتے ہیں، وہ سب صنعتی انقلاب کے حاشیے سے زیادہ کچھ نہیں۔ شاید یہی سب کچھ آج کے دور کے بارے میں سچ ہو۔ تاریخدان اور ہمارے جانشین کے طور پر کام کرنے والے روبوٹس اکیسویں صدی میں جدید ترین ڈیجیٹل ٹیکنالوجی کی تاریخ لکھیں گے۔

صنعتی انقلاب نے پیداوار کی دنیا میں انقلاب برپا کر دیا تھا۔ کم افراد کی مدد سے بہت بڑے پیمانے پر صنعتی پیداوار کو کئی گنا بڑھانا ممکن ہوگیا۔ آج کی دنیا میں اگر ٹیکنالوجی کی پیش رفت اور وسعت ممکن بنائی جا سکے تو عالمی معیشت کو غیر معمولی حد تک مہمیز دینے میں خاطر خواہ مدد مل سکتی ہے۔

جس اعتماد کے ساتھ انیسویں صدی کا تجزیہ کیا جا سکا ہے، بالکل اُسی اعتماد کے ساتھ اکیسویں صدی کا تجزیہ ممکن نہیں۔ چین کا ابھرنا، دنیا بھر میں قبائلی بنیاد پر سیاست کو تیزی سے ملنے والا فروغ اور لبرل ڈیموکریسی کی شکست و ریخت بالکل سامنے کی باتیں ہیں۔ اگر اور باریکی سے

جائزہ لیجیے تو اسلامی انتہا پسندوں کی جانب سے دہشت گردی کی گرم بازاری ہے۔ امریکی صدر ڈونلڈ ٹرمپ کے عہد میں یہ سوچنا حیرت انگیز نہیں کہ دنیا بھر میں اشتراکِ عمل کا کلچر تیزی سے دم توڑ رہا ہے اور بڑی طاقتوں کے درمیان ایک دوسرے کو نیچا دکھانے کا ایک ایسا کھیل شروع ہو چکا ہے جو مزید خرابیاں پیدا کر رہا ہے اور دنیا بھر میں بڑے پیمانے پر تباہی کا باعث بھی بن سکتا ہے۔

دنیا بھر میں بہت سی تبدیلیاں رونما ہو رہی ہیں اور ان تبدیلیوں کے حوالے سے بہت کچھ کہا جا رہا ہے، مگر حقیقت یہ ہے کہ اس وقت دنیا دوسرے صنعتی انقلاب کی دہلیز پر کھڑی ہے۔ یہ دوسرا صنعتی انقلاب درحقیقت ڈجیٹل نوعیت کا ہے۔ اور اس کے نتیجے میں رونما ہونے والی تبدیلیوں کا دائرہ پہلے صنعتی انقلاب کے دائرے سے زیادہ وسیع ہوگا۔ ڈجیٹل انقلاب اب تک وارد نہیں ہوا۔ یہ بس وارد ہوا ہی چاہتا ہے۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ ہمارے ارد گرد بہت کچھ دکھائی دے رہا ہے، مگر حقیقت یہ ہے کہ یہ سب کچھ بچوں کے لیے تیار کیے جانے والے کھلونوں سے زیادہ کچھ نہیں۔ جو کچھ رونما ہونے لگے گا۔ پیداواری صلاحیت میں کئی گنا اضافہ ہوگا، جس کے نتیجے میں عالمی معیشت کے پنپنے کی رفتار حیرت انگیز حد تک بڑھ جائے گی۔ ۱۹۷۰ء کے بعد عالمی معیشت میں سستی آ گئی تھی اور پیداواری صلاحیت گھٹ گئی تھی۔ پھر مزدوروں کی استعداد بڑھانے میں تھوڑی بہت کامیابی ملی، جس کے نتیجے میں معاملات درست ہوئے اور معیشتوں کو فروغ دینے میں اطمینان بخش حد تک کامیابی ملی۔ کمپیوٹرائزڈ لاجسٹکس کی مدد سے ۲۰۰۷ء کے بعد معاشی ترقی کی رفتار بڑھائی جا سکی۔ اب پھر رفتار کم ہو چکی ہے۔ ڈیجیٹل انقلاب کے برپا ہونے کی صورت میں عالمی معیشت کو ایک بار پھر فروغ دیا جا سکے گا۔

ٹیکنالوجی کے شعبے میں غیر معمولی پیش رفت کے باوجود گزشتہ دہائی کے دوران دنیا بھر میں پیداوار کا شعبہ کمزور رہا ہے۔ اس کا مفہوم یہ ہے کہ مشینیں توقعات کے مطابق پیداوار دینے میں ناکام رہی ہیں۔ مگر خیر، اب بہت کچھ یا سب کچھ تبدیل ہونے والا ہے۔ جب سے کمپیوٹر ہماری زندگی میں آئے ہیں، تب سے مصنوعی ذہانت کے حوالے سے بہت کچھ سوچا جاتا رہا ہے اور اس سلسلے میں عملی سطح پر بھی بہت کچھ کیا گیا ہے۔ ابتدا میں مصنوعی ذہانت کو پروان چڑھانے کی رفتار کم تھی اور اس کا بنیادی سبب یہ تھا کہ ابتدائی دور کے کمپیوٹر انسانی ذہن کی سی تیزی سے کام کرنے کے قابل نہ تھے۔ ''مورز لاء'' کے مطابق کمپیوٹر کی ذہانت میں تیزی سے اضافہ ہوتا گیا اور آج ہمارے سامنے ایسے کمپیوٹر ہیں، جو برق رفتاری سے کام کرتے ہیں اور دیا ہوا کام مطلوبہ نفاست اور جامعیت کے ساتھ مکمل کرتے ہیں۔ مصنوعی ذہانت کے حوالے سے انسان اب بھی اپنی منزل سے دور ہے، مگر اب امیدیں زیادہ توانا ہیں۔ کمپیوٹر کو مطلوبہ تیزی اور نفاست کے ساتھ استعمال کرنا اب بہت حد تک ممکن ہو چکا ہے۔ ایسے میں امید کی جانا چاہیے کہ بہت جلد یعنی ایک آدھ عشرے کے دوران ایسے کمپیوٹر تیار کیے جا سکیں گے، جو بالکل انسانی ذہن کی تیزی اور جامعیت کے ساتھ کام کر سکیں۔ بہت سے کام مصنوعی ذہانت پر چھوڑ کر انسان اپنے لیے بہتر کام تلاش کر سکتا ہے، یعنی ایسے کام جن کے کرنے سے انسان کا معیار بلند ہو، اُس کے ذہن میں وسعت پیدا ہو اور وہ اس دنیا کو زیادہ سے زیادہ ''قابلِ رہائش'' بنانے میں کامیاب ہو۔

انسانی ذہن جس رفتار سے کام کر سکتا ہے، اُسی رفتار سے کام کرنے والے کمپیوٹر اب روئے ارض پر موجود ہیں۔ چند عشروں کے دوران ہارڈ ویئر کے شعبے میں غیر معمولی ترقی نے انتہائی تیزی سے کام کرنے والے کمپیوٹر تیار کرنا ممکن بنا دیا۔ کمپیوٹر کی مدد سے لگائے جانے والے اندازوں کے مطابق انسانی ذہن ایک سیکنڈ میں کروڑوں آپریشنز کر ڈالتا ہے۔ یہ رفتار انتہائی حیرت انگیز ہے، مگر انسان نے ایسے کمپیوٹر تیار کر لیے ہیں، جو فی سیکنڈ ۱۰ تا ۱۰۰ پیٹا فلاپ کی رفتار سے کام کرتے ہیں، یعنی انسانی ذہن کی طرح کمپیوٹر بھی ایک سیکنڈ میں کروڑ ہا آپریشنز کر گزرتے ہیں اور وہ بھی جامعیت کے ساتھ۔ اب مسئلہ یہ ہے کہ ایسے انتہائی جاندار کمپیوٹر بہت بڑے حجم کے ہیں، ان کی لاگت بھی بہت زیادہ ہے اور انہیں چلانے پر بجلی بھی بہت خرچ ہوتی ہے۔ انسان کے لیے اس وقت بنیادی مسئلہ سپر کمپیوٹر کے حجم کو چھوٹا کرنا ہے، تاکہ وہ بہتر انداز سے کام کریں اور انہیں چلانا معاشی اعتبار سے مشکلات پیدا کرنے کا باعث نہ بنتا ہو۔ محققین کا اندازہ ہے کہ ۲۰۴۵ء تا ۲۰۶۰ تمام انسانی کام کمپیوٹر کی مدد سے کیے جانے لگیں گے۔ ایک عشرے کے دوران مصنوعی ذہانت کے شعبے میں غیر معمولی رفتار سے پیش رفت ہوئی ہے۔ بہت کچھ ایسا ہے جو مصنوعی ذہانت کے بل پر کیا جانے لگا ہے۔ ایک ڈیڑھ عشرے میں صورتِ حال مزید واضح ہو جائے گی اور انسان اس قابل ہو جائے گا کہ زیادہ سے زیادہ کام کمپیوٹر کے حوالے کر کے خود سکون کا سانس لیتا رہے۔ دل کا آپریشن بھی کمپیوٹر کی مدد سے کیا جانے لگے گا۔ مصنوعی ذہانت کو سوچنے کے حوالے سے بھی تیار کیا جا رہا ہے۔ پندرہ بیس برس میں کمپیوٹر خود ہی ناول بھی لکھنے لگیں گے۔ یہ سب کچھ انسان کے خوابوں کا معاملہ تھا، جواب حقیقت کا روپ دھار رہا ہے۔

آج بھی دنیا بھر میں بہت سے صنعتی اور تجارتی کام روبوٹس کی مدد سے کیے جا رہے ہیں۔ روبوٹس ریستوران میں گاہکوں کو کھانا بھی پیش کر رہے ہیں۔ روبوٹس ہی فیکٹریوں میں گاڑیاں بھی تیار کر رہے ہیں۔ معترضین کا کہنا ہے کہ روبوٹس اور سپر کمپیوٹر کی آمد سے بے روزگاری کا مسئلہ

انتہائی خطرناک شکل اختیار کرلے گا، کیونکہ دنیا بھر میں کروڑوں افراد بے روزگار ہوجائیں گے۔ ماہرین کہتے ہیں کہ کسی نوکری کا نہ ہونا یا یکسر بے روزگار بیٹھے رہنا بہت حد تک سستی یا کاہلی کا معاملہ ہے۔

اچھی طرح ذہن نشین کر لیجیے کہ ٹیکنالوجی کی مدد سے رونما ہونے والا انقلاب سب سے بڑا جیو پولیٹیکل انقلاب ہوگا، یعنی سبھی کچھ بدل جائے گا۔ یورپ کے صنعتی انقلاب نے انسان کی جسمانی قوت پر مدار کم کر دیا تھا، تاہم ذہن کو ہٹانے میں کامیابی نہیں ملی تھی۔ ٹیکنالوجیکل انقلاب یہ مسئلہ بھی حل کر دے گا یعنی انسانی ذہن کو زیادہ بروئے کار لانے کی ضرورت باقی نہیں رہے گی۔ یہ ہوگا حقیقی انقلاب۔ جب مشینیں خود ہی سوچنے لگیں گی، تب انسان کے لیے اپنے وجود کی معنویت کے حوالے سے سب سے بڑا مسئلہ اٹھ کھڑا ہوگا۔ کیا سب کچھ مشینوں کے حوالے کرکے انسان گوشہ نشینی اختیار کر لے گا؟

آج بھی یہ سوال کروڑوں افراد کے ذہنوں میں گردش کر رہا ہے کہ کیا واقعی مشینیں یعنی کمپیوٹر انسانی ذہن کی طرح سوچنے کے قابل ہوسکیں گی۔ ہوسکتا ہے کہ ایسا ممکن نہ ہو پائے یعنی انسانی ذہن کی سی سوچنے کی صلاحیت مشینوں میں پیدا نہ ہو سکے، یعنی اس حقیقت سے بہرحال انکار نہیں کیا جا سکتا کہ وہ زمانہ بہت دور نہیں، جب مشینیں سب کچھ کرنے لگیں گی اور انسان کے لیے اپنے وجود کو اور اس کی معنویت کو برقرار رکھنا انتہائی دشوار ہوجائے گا۔

آنے والے دور میں کسی بھی ملک کے لیے بقا کی ایک ہی صورت ہوگی ...... مصنوعی ذہانت کے شعبے میں ہوش رُبا نوعیت کی پیش رفت۔ آج چین کی بڑھتی ہوئی قوت کا غلغلہ ہے۔ یومیہ لاکھوں الفاظ چین کے بارے میں لکھے جارہے ہیں۔ ایک ڈیڑھ عشرے کے بعد سب کچھ سمٹ کر ایک سوال میں سما جائے گا ...... کیا چین مصنوعی ذہانت کے شعبے میں دوسروں کو پچھاڑ سکتا ہے؟ زندگی کا ہر معاملہ مصنوعی ذہانت کے مدار کے گرد گھومنے لگے گا۔ اس کا سیدھا اور سادہ مفہوم یہ ہے کہ آنے والے دور میں صرف وہی اقوام زندہ رہ سکیں گی، جو ٹیکنالوجی کے شعبے میں اپنی اہلیت ثابت کرسکیں گی۔ جس قوم میں سوچنے کی جتنی صلاحیت ہوگی، وہ بھرپور ترقی کرنے کی اُسی قدر اہل ہوگی۔ اور ٹیکنالوجی کے شعبے میں پیش رفت ہی اُس کی بقا کی ضمانت فراہم کرے گی۔

ہر شعبے میں ٹیکنالوجی کا غلغلہ ہوجانے سے مشکلات بڑھیں گی۔ جنگ ہی کو لیجیے۔ سب کچھ مشینوں کے ہاتھ میں ہوگا تو اسلحہ انتہائی خطرناک حد تک جدید ہوجائے گا۔ مگر تب جنگ کا خطرہ شاید باقی نہ رہے؟ سیدھی سی بات ہے، اگر انسانی ذہن بروئے کار لانے کی ضرورت ہی نہ رہے گی تو جنگ کیوں لڑی جائے گی؟ جنگ تو ہوتی ہی اِس لیے ہے کہ انسان اپنے ذہن کی برتری ثابت کرنا چاہتا ہے۔ یہی حال دیگر معاملات کا ہے۔ مصنوعی ذہانت کے حامل نمایاں ممالک بہت کچھ پالیں گے۔ جن میں اس حوالے سے پیش رفت کی طاقت نہ ہوگی وہ بہت پیچھے رہ جائیں گے۔ معاملہ دوسرے یا تیسرے درجے کی نہیں، بلکہ دسویں، گیارہویں درجے کی زندگی بسر کرنے کا ہوگا۔

ٹیکنالوجی میں ہونے والی پیش رفت نے لبرل ڈیموکریسی کو بھی خطرے میں ڈال دیا ہے۔ تارکین وطن کے حوالے سے اپنائے جانے والے رویے نے لبرل ڈیموکریسی کے مستقبل پر پہلے ہی بہت بڑا سوالیہ نشان لگادیا ہے۔ بے روزگاری کا مسئلہ بھی بہت بڑے خطرے کی شکل میں سروں پر منڈلا رہا ہے۔ امریکا میں کم و بیش ۲۰ لاکھ ٹرک ڈرائیور ہیں۔ مصنوعی ذہانت کی مدد سے ایسے ٹرک بھی تیار کر لیے گئے ہیں جو ڈرائیور کے بغیر چلائے جا سکتے ہیں۔ اگر یہ سب کچھ بہت بڑے پیمانے پر ممکن بنایا جا سکا تو بے روزگاری کس حد تک بڑھے گی اس کا اندازہ لگاتے ہوئے انسان کانپنے لگتا ہے۔

اگر بے روزگاری کے عفریت کو قابو میں رکھنا ممکن نہ ہو سکا تو لبرل ڈیموکریسی کہاں کھڑی ہوگی؟ دنیا بھر میں لبرل ڈیموکریسی کو ایک ایسے سیاسی ماڈل کے روپ میں پیش کیا جاتا رہا ہے، جو وسیع النظری اور معاشی استحکام کی ضامن ہے۔ تارکین وطن کو قبول کرنے سے واضح گریز اور بے روزگاری کے گھوڑے کو لگام ڈالنے میں ناکامی لبرل ڈیموکریسی کو عبرت ناک انجام سے دوچار کرکے دم لیں گے۔

ماہرین یہ اندازے بھی قائم کرتے رہے ہیں کہ مصنوعی ذہانت کے غیر معمولی فروغ سے بے روزگاری کس حد تک بڑھے گی۔ ماہرین کا ایک اندازہ یہ ہے کہ ۲۰۳۰ء کے عشرے کی ابتدا میں امریکا میں ۳۸ فیصد ملازمتیں ختم ہوجائیں گی۔ ماہرین کا یہ بھی کہنا ہے کہ ۲۰۴۰ء کے عشرے کے دوران کمپیوٹرز ناول بھی لکھنے لگیں گے۔ اِسی طور فطری علوم وفنون کے شعبے میں غیر معمولی نوعیت کی تحقیق کمپیوٹر کے ہاتھوں انجام کو پہنچے گی۔ یہ صورتِ حال کتنی خطرناک ہے اِس کا اندازہ کم ہی اقوام کو ہے۔ تبدیلی اِتنے بڑے پیمانے پر آنے والی ہے کہ اُس کے بارے میں سوچنے سے بھی گریز کیا جارہا ہے، کیونکہ تصور کرنے ہی سے کپکپی طاری ہونے لگتی ہے۔ اس وقت عالمی سطح پر کم و بیش ۱۰ فیصد بے روزگاری ہے۔ اس کے نتیجے میں جرائم کی شرح بلند ہو رہی ہے۔ اگر بے روزگاری ۲۰ فیصد تک ہوتو عالمی سطح پر ہنگامی حالت نافذ کرنا ہوگی۔ اب ذرا سوچیے کہ دنیا کے تمام کاموں کا ۴۰ فیصد تک کمپیوٹرز کرنے لگیں تو کیا ہوگا؟ یہ تو خونی انقلابات کا معاملہ ہے۔ ٹیکنالوجی میں پیش رفت سے بڑے بڑے کاروباری ادارے غیر معمولی منافع ضرور کمائیں گے مگر بے روزگاری کے ہاتھوں معاشروں میں شدید عدم استحکام بھی تو پیدا ہوگا۔

ٹیکنالوجی کی پیش رفت سیاست کو بھی مکمل طور پر تبدیل کردے گی۔ فی زمانہ کوئی بھی سیاسی نظام روزگار فراہم کرنے سے کہیں بڑھ کر معاشی استحکام برقرار رکھنے یعنی معیشت کو نظم وضبط سے ہم کنار رکھنے کا ایک اہم ذریعہ ہے۔ جب بہت کچھ کمپیوٹر کے ہاتھ میں ہوگا اور بہتر نظم ونسق کے تحت کام کررہا ہوگا، تب سیاست کے کرنے کے لیے کیا رہ جائے گا؟

مصنوعی ذہانت کے دور میں معیشت کو مستحکم رکھنے اور معاشروں کو کنٹرول میں رکھنے کا ایک اچھا طریقہ تو وہ ہوسکتا ہے جو اشتراکیت نے سجھایا ہے یعنی جو کچھ بھی حاصل ہو، وہ لوگوں میں اُن کی ضرورت کے مطابق تقسیم کردیا جائے۔ مگر یہ قابلِ عمل اس لیے نہیں کہ پیداوار کے ذرائع پر اشتراکیوں کی اجارہ داری نہیں۔ لبرل ڈیموکریسی کے لیے یہ وقت بحران کا ہے۔ اُسے ابھی سے طے کرنا ہے کہ جب معاشرہ مکمل طور پر مصنوعی ذہانت کے ہاتھ میں ہوگا، تب اس کا کردار کیا ہوگا اور وہ عوام کو زیادہ سے زیادہ مطمئن رکھنے میں کس حد تک کامیاب ہوسکے گی۔

ایک بات تو طے ہے کہ آنے والے دور میں سرمایہ دارانہ نظام زیادہ کارگر ثابت نہیں ہوگا۔ زیادہ سے زیادہ منافع کمانے کی دوڑ میں دوسروں سے آگے نکل جانے والے اداروں کو اب سوچنا ہوگا کہ جب معاشرے میں بے روزگاری کی شرح خطرناک حد تک بڑھ جائے گی، تب اپنے وجود کو کس طور برقرار رکھا جاسکے گا۔

اب دنیا کو طے کرنا ہے کہ اُسے کس طرف جانا ہے اور کس طرح جانا ہے۔ مصنوعی ذہانت سے زندگی کا معیار قابلِ رشک حد تک بلند ہوگا۔ ماحول کو ہر طرح کی آلودگی سے پاک رکھنا اس حد تک ممکن ہوجائے گا کہ انسان کو اپنی آنکھوں پر یقین نہیں آئے گا۔ مایوس ہونا لازم نہیں۔ مصنوعی ذہانت ایک بہت بڑے چیلنج کی صورت میں ہمارے سامنے آنے والی ہے۔ ہمیں اس چیلنج کا سامنا کرنا ہے اور یہ بھی یاد رکھنا ہے کہ یہ چیلنج ہمارا اپنا پیدا کردہ ہے۔ ابھی بہت کچھ ہونا ہے۔ رائٹ برادران نے طیارہ تیار کیا، تب سے خلائی شٹل تک بہت کچھ ہوا۔ مصنوعی ذہانت کا معاملہ بھی کچھ ایسا ہے۔ ابھی بہت کچھ کیا جانا ہے۔ تحقیق کا بازار گرم ہے۔ مصنوعی ذہانت کو ہر معاملے میں اپنی اہمیت منوانی ہے، مگر اس سے بہت پہلے انسان کو اُس آنے والے دور کے لیے تیار ہونا ہے۔ مایوس ہوکر ایک طرف بیٹھ جانے سے یہ مسئلہ حل نہیں ہوگا۔ بہت کچھ ہے جو پس منظر کی نذر ہوجائے گا۔ ثقافت، زبان، اقدار، نسل اور دوسری بہت سی حقیقتیں گم ہوکر رہ جائیں گی۔ جب سارے کام مشینوں کی مدد سے ہونے لگیں گے، تب اس بات کی پروا کون کرے گا کہ کس کا تعلق کس ثقافت یا نسل یا زبان سے ہے۔ اس حوالے سے انسان کو ابھی سے تیار ہونا ہے۔ سارے کام مشینوں پر چھوڑ دینے کی صورت میں زندگی میں خلاء بھی تو پیدا ہوگا۔ ایک بڑا بحران مذہب کے لیے بھی اٹھ کھڑا ہوگا۔ جب بہت کچھ بہت آسانی سے ہونے لگے گا تو کسی برتر ہستی پر یقین رکھنے کی ضرورت کم ہی لوگوں کو محسوس ہوگی۔ جو کچھ ہونے والا ہے اُسے روکنا ممکن نہیں تاہم اُس کا بہتر انداز سے سامنا کرنے کے لیے تیار ہونا بہت حد تک ممکن ہے۔ انسان کو ایک بہت بڑے بحران کے لیے تیار رہنا ہے۔ اگر ابھی سے سوچا جائے گا تو ٹیکنالوجی کی بھرپور پیش رفت کے دور میں بیشتر معاملات کو کنٹرول میں رکھنا کسی حد تک ضرور ممکن ہوگا۔

قدرت کے حیرت انگیز کرشمے

"سبح اسم ربک الاعلیٰ، الذی خلق فسویٰ، والذی قدر فھدی" (اپنے رب برتر کے نام کی تسبیح کرو، جس نے پیدا کیا اور تناسب قائم کیا، جس نے تقدیر بنائی، پھر راہ دکھائی)۔

یعنی ہر چیز کو پیدا کیا اور نہایت مناسب شکل میں پیدا کیا اور اس تخلیق کے ہر پہلو کو کامل بنایا، اس حد تک کامل کہ کوئی اس میں یہ نہیں کہہ سکتا کہ اس کی فلاں چیز اس کے لئے مناسب نہیں ہے، اللہ نے تقدیر یوں بنائی کہ ہر چیز کیلئے اس کا فرض منصبی مقرر کردیا اور اس کا مقصد تخلیق اور اس مقصد کو پورا کرنے کا طریقہ بھی اسے سمجھا دیا، ہر چیز کو عجیب الہامی انداز میں یہ تعلیم دی گئی، ہر چیز کو یہ شعور بھی بذریعہ الہام دے دیا کہ اس کی مقررہ زندگی کے لیے اس کو کس کس چیز کی ضرورت ہے۔

یہ ایک عظیم حقیقت ہے اور اس کائنات کی جس چیز کا تجزیہ کیا جائے، اس کے اندر یہ حقیقت موجود ہے، اس وسیع وعریض کائنات کی ہر چیز میں خواہ بڑی ہو یا چھوٹی ہو، اہم ہو یا حقیر ہو، ہر چیز کی تخلیق میں تناسب موجود ہے، ہر چیز کامل الخلقت ہے اور ہر چیز کی تخلیق کا ایک مقصد ہے اور وہ مقصد اس کی تقدیر ہے اور ہر چیز کو اللہ نے اپنا مقصد وجود پورا کرنے کے لیے نہایت ہی آسان طریقہ کار فراہم کردیا ہے، غرض اللہ کی ہر مخلوق مکمل اور متناسب ہے اور ہر چیز اپنا انفرادی فریضہ ادا کرتی ہے۔

مثلاً ایٹم، ایک اکیلا ایٹم، پروٹون اور الیکٹرون کی برقی رفتار کے اندر اسی قدر توازن رکھتا ہے جس طرح ایک کہکشاں اپنے سورج اور اس کے تابع ستاروں کے درمیان توازن رکھتی ہے، ایک ایٹم اپنے مقصد اور فریضے کو اس طرح پورا کرتا ہے، جس طرح ایک کہکشاں پورا کرتی ہے، دونوں کا اپنا مقصد اور طریقۂ حصول مقصد معلوم ہوتا ہے۔

ایک منفرد خلیہ ایک مکمل تخلیق ہے اور اس کے اندر اپنا مقصد تخلیق پورا کرنے کی پوری استعداد ہوتی ہے اور وہ اپنا مقصد اسی طرح پورا کرتا ہے جس طرح کوئی اعلیٰ مرکب اور پیچیدہ مخلوق کرتی ہے۔

پھر ایک منفرد ایٹم اور کسی کہکشاں کے درمیانی درجات پر الگ الگ مخلوق ہے، جس طرح ایک منفرد خلیہ اور پیچیدہ ترین مخلوقات کے درمیان زندہ مخلوقات کے مختلف درجے اور ان کی تنظیم ہے اور ہر درجے اور ہر تنظیم کی تخلیق میں کمال اور تسویہ ہے اور ہر ایک کے لیے انفرادی فرائض اور اجتماعی مقاصد ہیں، دست قدرت الہامی طریقے سے ان سے یہ کام کراتا ہے اور اس گہری حقیقت یعنی تخلیق وتسویہ کا یہ کام پوری کائنات پر شاہد عادل ہے۔

اس حقیقت کو انسانی قلب پا سکتا ہے، بشرطیکہ وہ اس کائنات کے اشارات اخذ کرنے لیے تیار ہو اور کھلے دل سے وہ اس کائنات کی موجودات پر غور کرے، انسان کا اکتسابی علم جس درجے کا بھی ہو اور وہ ترقی یافتہ معاشرے کا فرد ہو یا پسماندہ معاشرے کا فرد ہو، وہ کائنات کی ان اشیاء سے یہ الہامی اشارات اخذ کرسکتا ہے، بشرطیکہ اس کے دل ودماغ کے دریچے بھی ان اشارات کو پانے کے لیے تیار ہوں اور کھلے ہوں اور کسی عقل وخرد کے تار اس قابل ہوں کہ وہ مضراب حقیقت کے جواب میں نغمہ بار ہوسکے۔

اس کے بعد کائنات کا مشاہدہ اور کسبی علم آتے ہیں اور انسان مطالعہ فطرت میں پہلی نظر سے جو الہام پاتا ہے، تمام مشاہدات اس کی تائید کرتے ہیں، بعض لوگوں نے مشاہدۂ کائنات کے ذریعہ ایسے اشارات جمع کیے ہیں، جو اس کائنات کے اندر پوشیدہ مجموعی حقیقت کے چہرے سے پردہ اٹھاتے ہیں۔

نیویارک کی سائنسی علوم کی اکیڈمی کے صدر کریسی موریسن اپنی کتاب ''انسان اکیلا نہیں کھڑا'' میں اپنے مشاہدات یوں قلمبند کرتے ہیں:

''پرندوں میں وطن لوٹنے کا ایک ملکہ ہوتا ہے، ایک خاص چڑیا جو دروازوں پر گھونسلے بناتی ہے، خزاں کے موسم میں جنوب کی طرف ہجرت کرجاتی ہے اور اگلے سال بہار میں اپنے اسی مقام کی طرف لوٹ آتی ہے، ستمبر کے مہینے میں امریکہ کے اکثر پرندے جنوب کی طرف چلے جاتے ہیں اور وہ سمندروں اور صحراؤں پر سے پرواز کرتے ہوئے ہزاروں میل سفر کرتے ہیں اور کبھی اپنا راستہ نہیں بھولتے اور پیغام رساں کبوتر پنجرے میں طویل سفر کرتے ہیں اور جب ان کو پیغام دے کر چھوڑا جاتا ہے تو وہ کچھ دیر کے لئے حیران ہوکر چکر لگاتے ہیں اور اس کے بعد وہ سیدھے اپنے وطن کی طرف پرواز کرتے ہیں اور کبھی راہ نہیں بھٹکتے، شہد کی مکھی اگر کسی طرف جائے اور اس کے پیچھے نشانات راہ کسی طوفان کی وجہ سے مٹ جائیں تو بھی وہ راہ نہیں بھولتی اور سیدھی چھتے پر آجاتی ہے، البتہ انسان کے اندر یہ جبلت کمزور ہے اور انسان اس کمی کو اپنے آلات اور عقل کے ذریعہ پوری کردیتا ہے، باریک کیڑے مکوڑے بھی نہایت ہی چھوٹی اور خوردبینی

آنکھیں رکھتے ہیں اور یہ نہایت ہی مکمل آنکھیں ہوتی ہیں، باز اور عقاب وغیرہ کی آنکھیں دوربین کی طرح ہوتی ہیں، انسانی آنکھ ان کا مقابلہ نہیں کرسکتی، اس کمی کو بھی انسانی عقل وتجربہ نے پورا کیا ہے، چنانچہ ان دوربینوں کے ذریعہ انسان سحابیوں کو دیکھ لیتا ہے اور اس نے ان کے دیکھنے کے لئے انسانی نظر کو بیس لاکھ گنا تیز کیا، نیز انسان نے ایسی خردبینیں ایجاد کیں، جن کے ذریعے وہ بیکٹیریا اور دوسرے نہ نظر آنے والے کیڑے مکوڑے دیکھتا ہے۔

اب ذرا تم اپنے بوڑھے گھوڑے کو راستہ پر چھوڑ دو، جس قدر اندھیرا بھی ہو، وہ راستہ نہ بھولے گا، وہ سخت تاریکی میں بھی دیکھ سکتا ہے، اگرچہ بہت واضح نہ سہی، وہ راستہ میں اور اس کے دونوں جانب درجہ حرارت کو بھی دیکھ سکتا ہے، یہ درجہ حرارت اس کی آنکھیں انفراریڈ شعاعوں کے ذریعے معلوم کرلیتی ہیں، اُلو ایک گرم چوہے کو سردگھاس کے نیچے چلتا پھرتا دیکھ لیتا ہے، اگرچہ سخت اندھیرا ہوا اور انسانوں نے تو بجلی کے قمقموں کے ذریعہ تاریک رات کو دن بنا دیا ہے۔

شہد کی مکھیوں کی دنیا بھی عجیب ہے، کارکن مکھیاں چھتے میں مختلف قسم کے کمرے بناتی ہیں، یہ تربیت کے لیے استعمال ہوتے ہیں، چھوٹے کمرے کارکنوں کے لیے استعمال ہوتے ہیں اور بڑے کمرے نرمکھی کے لیے اور ملکہ کے لیے خاص کمرے تیار ہوتے ہیں، یہ ملکہ مکھی جب غیر بارآور انڈہ دیتی ہے تو اسے نرمکھی کے کمرے میں رکھ دیتی ہے اور جب بارآور انڈہ دیتی ہے تو اسے اس کمرے میں رکھ دیتی ہے، جس میں مؤنث کارکن مکھیاں ہوتی ہیں جو آگے جاکر ملکہ مکھی بننے والی ہوتی ہیں اور وہ کارکن مکھیاں جو مزدور ہوتی ہیں، جب وہ ایک طویل عرصہ تک نسل تیار کرنے کا کام کرلیتی ہیں تو ان کو بدل دیا جاتا ہے، یہ کارکن مکھیاں بچوں کے لیے غذا تیار کرنے کا کام بھی کرتی ہیں، یہ شہد اور پھلوں کو چبا کر ہضم کے قابل بناتی ہیں اور بچوں کے اندر نر اور مادے کا ظہور ہوجاتا ہے تو پھر یہ مذکورہ بالا طریقے سے غذا ہضم تیار کرنے کا عمل ترک کردیتی ہیں، اس کے بعد ان کو شہد اور پھولوں کا بور دیا جاتا ہے اور بچوں میں سے جو مؤنث اس طریقے سے تربیت پاتی ہیں، وہ بعد میں کارکن مکھیاں بن جاتی ہیں۔

جو مؤنث مکھیاں ملکہ مکھیوں کے حجروں میں ہوتی ہیں تو ان کو شہد اور پھولوں کے بورے کو ابتدائی طور پر قابل ہضم بنا کر غذا دینے کا سلسلہ جاری رکھا جاتا ہے اور جن مؤنث مکھیوں سے ایسا سلوک کیا جاتا ہے، بعد میں وہ ملکہ مکھی بن جاتی ہیں، صرف یہ ملکہ ہی ایسے انڈے دیتی ہیں جو بارآور ہوتے ہیں، اس ٹیکنالوجی کے مطابق جو بچے پیدا ہوتے ہیں، ان کے لیے خاص قسم کے حجروں، ایک خاص قسم کے انڈوں اور ایک خاص قسم کی غذا کی ضرورت ہوتی ہے اور غذا کے اندر تبدیلی کا اثر بھی عجیب ہوتا ہے، اس قسم کی ٹیکنالوجی کے لیے مکھیوں کو ایک طویل عرصہ تک انتظار کی ضرورت پڑی ہوگی، جنہوں نے ان اصولوں کے اندر تمیز کرکے ان کو نافذ کیا ہوگا اور غذا کے اثرات معلوم کئے ہوں گے اور ان اثرات کو اجتماعی طور پر نافذ کیا ہوگا، جو ان کے وجود کے لیے ضروری ہوگا، مکھیوں نے جب اجتماعی زندگی کا آغاز کیا ہوگا، تب ان کو یہ اصول معلوم ہوئے ہوں گے، کیونکہ مکھی کے وجود اور زندگی کی بقا کے لئے ان اصولوں کی دریافت ضروری نہ تھی، لہٰذا معلوم ہوتا ہے کہ شہد کی مکھی نے غذا کے اثرات کے سلسلے میں انسان سے زیادہ تحقیق کی ہے۔''

مغربی فکر میں ڈوبا ہوا مصنف یہ ماننے کیلئے تیار نہیں ہے کہ اللہ نے جب مکھی کو پیدا کیا تو یہ سب کچھ سکھا دیا، ان کے دماغوں پر ڈارون کا فلسفہ ارتقاء ہی بیٹھا ہوا ہے، حالانکہ قرآن صاف کہتا ہے:

"وعلم آدم الاسماء کلها" (اللہ نے آدم کو تمام نام سکھا دیے) اسی طرح اللہ نے مکھی کو بھی تمام بنیادی تعلیم دے دی تھی۔

''کتے کو ایک اضافی ناک دی گئی ہے، جس کے ذریعہ وہ تمام جانوروں کی بوسونگھ لیتا ہے جو کسی راستے سے گزرے ہوں، انسان کی قوت شامہ کتوں کے مقابلے میں کمزور ہے اور آج تک انسان نے کوئی ایسا آلہ بھی ایجاد نہیں کیا، جو اس کی قوت شامہ کو ترقی دے، لیکن ہماری یہ کمزور قوت شامہ بھی اس قدر چھوٹے ذرات کو محسوس کرلیتی ہے، جنہیں مائیکروسکوپ کے ذریعہ ہی دیکھا جاسکتا ہے۔

اکثر حیوانات ایسی آوازیں سن لیتے ہیں، جو ہمارے کانوں کے پردوں کے اندر ارتعاش پیدا نہیں کرسکتیں، کیونکہ یہ ہماری سماعت کی حد سے بہت ہی دقیق اور باریک ہوتی ہیں، انسان نے ایسے آلات ایجاد کرلیے ہیں کہ وہ کئی میل دور اڑنے والی مکھی کے پروں کی آواز بھی سن لے، اس طرح کہ گویا وہ اس کے کان کے پردے کے اوپر بیٹھی ہے، ایسے ہی آلات کے ذریعہ سورج کی شعاعوں کی رفتار کی آواز بھی ریکارڈ کی جارہی ہے۔

پانی کی مکڑیوں کی ایک قسم ایسی ہے جو پانی کے اندر غبارے کی طرح ایک گھونسلا تیار کرتی ہے، یہ تار عنکبوت سے بنایا جاتا ہے اور اسے پانی کے نیچے کسی چیز سے باندھ دیا جاتا ہے، اس کے بعد یہ مکڑی اپنے جسم کے بالوں کے ساتھ پانی کا ایک بلبلہ باندھتی ہے اور اسے لے جاکر اس گھونسلے سے باندھ دیتی ہے، یہاں تک کہ گھونسلے کے گرد ہوا کے بلبلوں کا حصار بن جاتا ہے، اس کے بعد وہ گھونسلے کے اندر بچے دیتی ہے کہ وہ ہوا کے طوفان سے محفوظ رہیں، اس گھونسلے کی

ساخت میں ایک تو باریک بننے کا عمل ہے، اس کے بعد دقیق انجنیئرنگ اور ہوابازی کا گہرا ادراک ہے۔

سالم مچھلی، جو چھوٹی سی ہوتی ہے اور سمندر میں کئی سال تک گھومتی پھرتی ہے، اس کے بعد وہ اس دریا کی طرف واپس ہوتی ہے، جہاں اس کی پیدائش ہوئی تھی، آخر وہ کیا قوت ہے جو اسے اس کی جائے پیدائش تک رہنمائی کرتی ہے، یہ جب اپنی جائے پیدائش کی طرف بڑھتے ہوئے کسی غلط دریا کی طرف چلی جائے تو اسے فوراً معلوم ہوجاتا ہے کہ یہ دریا اس کی جائے پیدائش نہیں ہے، چنانچہ وہ دریا میں چلتی ہے اور پانی کے بہاؤ کے بالمقابل چل کر اپنی منزل تک پہنچ جاتی ہے۔

پانی کے سانپوں کا معاملہ تو بہت ہی عجیب ہے، ان کا قصہ سالمن مچھلی کے برعکس ہے، اس مخلوق خدا کی عمر جب پوری ہوتی ہے تو یہ مختلف تالابوں اور دریاؤں سے سفر کرکے گہرے سمندروں کی طرف جاتے ہیں، اگر یورپ میں ہوں تو یہ ہزاروں میل کا سفر طے کرکے جنوبی برمودا کی گہرائیوں کی طرف چلے جاتے ہیں، وہاں پھر یہ انڈے دے کر مرجاتے ہیں، اب ان کے جو بچے پیدا ہوتے ہیں تو وہ تو صرف یہ جانتے ہیں کہ وہ نہایت گہرے پانیوں میں ہیں، لیکن یہ بچے اسی راستے سے ساحل کی طرف جاتے ہیں، جس طرح ان کی ماں ساحل سے پانی کی طرف آئی تھی اور ساحل سے پھر یہ کسی دریا یا نہر یا حوض اور تالاب کی طرف چلے جاتے ہیں، چنانچہ پانیوں کی ہر قسم بحری سانپوں کے لیے موزوں ہوتی ہے، کیونکہ انہوں نے بڑی بڑی موجیں، طوفان اور سمندری تلاطم دیکھے ہوتے ہیں اور ان کا مقابلہ کیا ہوتا ہے، یہ ساحلوں پر چلتے ہیں اور جب یہ مکمل ہوجاتے ہیں تو کوئی خفیہ قانون ان کو مجبور کرتا ہے کہ وہ پھر واپسی کا سفر کریں اور گہرے سمندروں میں چلے جائیں، سوال یہ ہے کہ یہ جذبہ ان کے اندر کہاں سے پیدا ہوتا ہے، کبھی ایسا نہیں ہوا کہ کسی شکاری یا مچھیرے نے یورپی سمندروں میں امریکی بحری سانپ پکڑا ہو یا کسی امریکی مچھیرے کے جال میں یورپی سانپ آ گیا ہو، یورپی بحری سانپ کو چونکہ گہرے سمندروں تک لمبا سفر کرنا پڑتا ہے، اسی لئے قدرت نے اسے لمبی عمر عطا کی یا اس سے بھی زیادہ تاکہ وہ مرنے سے قبل اپنی منزل مقصود کو پہنچ سکے، کیونکہ یورپی بحری سانپ کو امریکی بحری سانپ سے زیادہ فاصلہ طے کرنا پڑتا ہے، ذرا دیکھو تو سہی کہ کون سے ایٹم اور کیا سالمے ہیں؟ جب بحری سانپ مچھلیوں کی شکل میں جمع ہوتے ہیں تو ان کے اندر اس قسم کی قوت ارادی پیدا ہوجاتی ہے جو ایسے دور دراز سفر کراتی ہے؟

جب مادہ پروانہ ہوا کے دباؤ میں تمہارے کسی روشن دان سے اندر آجاتی ہے تو وہ اپنے نر کو ایک سگنل بھیجتی ہے، چاہے وہ جتنا بھی دور ہو، بعض اوقات وہ بہت دور ہوتا ہے، لیکن وہ اس اشارے کو وصول کر لیتا ہے اور اس کا جواب دیتا ہے، اس کو گمراہ کرنے کی انسان جس قدر بھی کوشش کرے ممکن نہیں ہوتا کہ وہ غلطی کرے، کیا ان کے پاس کوئی ریڈیو اسٹیشن ہے یا اس نر کے پاس کوئی ریڈیو یا مشین ہے جو اس سے سگنل وصول کرتا ہے؟ ایریل کا ہونا تو بڑی بات ہے کیا اس کے پاس کوئی ایتھر ہے، جس کے ذریعہ وہ ارتعاش پیدا کرتی ہے؟ ٹیلی فون اور ریڈیو ہمارے پاس سریع الحرکت مواصلاتی آلات ہیں، لیکن یہ تاروں کے ذریعے ایک جگہ کو دوسری جگہ سے منسلک کرتے ہیں، اس طرح یہ پروانہ ہم پر فوقیت رکھتا ہے۔

نباتات اپنے وجود کو برقرار رکھنے کے لئے کئی چیزوں سے خدمت لیتے ہیں، بغیر ان کے علم وارادہ کے، مثلاً حشرات، پھولوں کا بورا ان کے لئے منتقل کرتے ہیں، ہوا بھی یہ کام کرتی ہے، وحوش وطیور بھی یہی کام کرتے اور ان کا بورا اور بیج بکھیرتے ہیں، سب سے آخر میں ان نباتات نے انسان کو بھی اپنے جال میں پھانس لیا، اس نے فطرت کو حسن بخشا اور فطرت نے اسے اس کا اجر دیا، لیکن انسان بھی تو کسی حد پر رکنے والا نہیں، ''ھل من مزید'' کا قائل ہے، اس نے ہل چلادیا، بیج بو دیا، فصل کاٹی، انبار بھرے، پھر اس نے فصلوں کو ترقی دی، شاخ تراشی کی اور خوراک کا بندوبست کیا، اگر وہ یہ کام چھوڑ دے تو بھوک سے مرجائے اور دنیا سے تہذیب وتمدن کا خاتمہ ہوجائے اور انسانیت پتھر کے دور میں واپس چلی جائے۔

پانی کے بے شمار جانور مثلاً جھینگا مچھلی کا ایک بازو گر کر کٹ جائے تو اسے معلوم ہوجاتا ہے کہ اس کے جسم کا ایک حصہ ضائع ہوگیا ہے، اس کے خلیے اور جینز اس عضو کو دوبارہ بنانا شروع کردیتے ہیں اور جب وہ عضو مکمل ہوجاتا ہے تو خلیے یہ کام بند کردیتے ہیں اور ان کو معلوم ہوجاتا ہے کہ ان کی ڈیوٹی ختم ہے۔

پانی کا وہ کیڑا جس کے کئی پاؤں ہوتے ہیں، جب دو ٹکڑے ہوجائے تو وہ ان میں ایک ٹکڑے کی مدد سے اپنے آپ کو مکمل کر لیتا ہے، اگر تم اس کیڑے کا سرکاٹ دو تو وہ دوسرا سر بنالیتا

ہے۔

ہم زخموں کو مندمل کر سکتے ہیں، لیکن ہمارے سرجن ابھی تک یہ بات نہیں جانتے کہ وہ خلیوں کو متحرک کریں اور وہ ایک نیا بازو بنا ڈالیں یا گوشت پوست، ناخن اور اعصاب بنا دیں، اگر ایسا ممکن ہو۔

اور ایک عجوبہ تو یہ ہے کہ اگر کوئی خلیہ ابتدائی ایام ہی میں دو مکمل حصوں میں تقسیم ہوجائے تو اس سے دو مکمل حیوان تیار ہوجاتے ہیں، ہم دیکھتے ہیں کہ توام ہم شکل ہوتے ہیں، اس کی تشریح اس طرح کی جاسکتی ہے کہ حمل کے ابتدائی مرحلہ میں خلیہ منقسم ہوگیا اور اس سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ ابتدائی مرحلے میں خلیہ مکمل فرد ہوتا ہے اور اسی طرح ایک فرد بھی ہر خلیہ میں ہوتا ہے۔''

ایک دوسری فصل میں یہی مصنف لکھتا ہے:

''شاہ بلوط کا بھورا بیج زمین پر گراتا ہے، اس کا بھورا چھلکا اسے محفوظ رکھتا ہے اور یہ گرتا پڑتا زمین میں کسی دراڑ میں اٹک جاتا ہے، موسم بہار میں اس کے اندر کا خلیہ جاگتا ہے، وہ اس چھلکے کو پھاڑ دیتا ہے اور یہ اس مغز سے خوراک حاصل کرتا ہے، جو اس چھلکے کے اندر جمع کردی گئی ہوتی ہے، جس کے اندر اس کے موروثی جینز ہوتے ہیں، اس کی جڑیں زمین میں جاتی ہیں، آپ دیکھتے ہیں کہ یہ پودا نمودار ہوتا ہے، چھوٹا درخت اور پھر کامل درخت بن جاتا ہے، اس کے اندر کئی ملین جینز ہوتے ہیں، یہاں تک کہ یہ اپنی جڑوں، چھلکے، پھل، تنوں اور شاخوں میں بھی اس درخت کے مماثل ہوتا ہے، جس سے وہ بیج نکلا، کروڑوں سال پہلے جو بلوط کا درخت پیدا ہوا تھا، اس کے پھل آج تک اپنے ذرات کی ترتیب اس طرح رکھتے ہیں جس طرح پہلے بلوط کے پھل نے رکھا تھا۔''

یہی مصنف تیسری فصل میں لکھتا ہے:

''ہر خلیہ جو کسی زندہ مخلوق میں پیدا ہوتا ہے، اس پر لازم ہے کہ وہ اپنے آپ کو اس طرح ڈھالے کہ گوشت کا حصہ ہو یا چمڑے کا حصہ ہو اور فنا ہوجائے یا دانت کی چمک بن جائے یا آنکھ کا سیال مادہ بن جائے یا ناک اور کان بن جائے، ہر خلیہ اپنے آپ کو ایسی شکل میں ڈھالتا ہے کہ وہ اپنا فرض منصبی پوری طرح ادا کرے، یہ بات نہایت ہی مشکل ہے کہ کوئی تعین کرے کہ کون سا خلیہ دائیں ہاتھ کا ہے یا بائیں ہاتھ کا، لیکن از روئے فطرت یہ بات متعین ہے کہ یہ خلیہ دائیں کان کا ہے اور یہ بائیں کان کا ہے، غرض ہزار ہا خلیات چلائے جاتے ہیں کہ وہ ایک صحیح کام کریں، صحیح وقت پر کریں اور صحیح جگہ پر کریں۔''

چوتھی فصل میں یہ شخص کہتا ہے:

''مختلف قسم کی مخلوقات میں بعض مخلوقات ایسے کام کرتی ہیں جو دانشمندی کے اعلیٰ مرتبہ کے ہیں، جن کی کوئی تشریح ہم نہیں کر سکتے مثلاً بھڑ، ٹڈے کو شکار کرتی ہے، زمین میں ایک گڑھا کھودتی ہے اور ایک مناسب جگہ اسے دفن کردیتی ہے، یہ شکار کرتے وقت اس کے ایسے مخصوص مقام پر ڈنگ مارتی ہے کہ وہ بے ہوش ہوجاتا ہے، لیکن اس کا گوشت صحیح وسالم زندہ رہتا ہے، اب مادہ بھڑ اس کے قریب ایک متعین مقام پر انڈے دیتی ہے، اسے شاید یہ بھی معلوم نہ ہوکہ جب اس کے بچے پیدا ہوں گے تو اس ٹڈے کا گوشت کھائیں گے، لیکن اسے قتل نہ کریں گے، کیونکہ یہ گوشت ان کی غذا ہے اور گوشت خراب ہوکر زہریلا نہ بن جائے، لازماً بھڑ نے ابتدا سے یہ کام شروع کیا ہوگا اور ہمیشہ وہ اسے دہراتی ہوگی ورنہ دنیا میں سے بھڑوں کا وجود ہی ختم ہوجاتا، سائنس کے پاس ایسی کوئی تشریح نہیں ہے کہ وہ بھڑوں کے اس مسلسل فعل کا سبب بیان کرے اور یہ بھی ممکن نہیں ہے کہ یہ کام بھڑیں محض اتفاق سے کرتی ہیں، کیونکہ مادہ بھڑ تو زمین کے اندر کھودے ہوئے گڑھے کو بھر کر چلی جاتی ہے اور مرجاتی ہے نہ وہ اور نہ اس کے اسلاف یہ جانتے تھے کہ وہ ایسا کیوں کررہی ہے، نہ اسے اس کا علم اور مشاہدہ ہوتا ہے کہ اس کے بعد اس کے بچوں کو کیا پیش آنا ہے، بلکہ بھڑ کو تو یہ علم بھی نہیں ہوتا کہ اس کے بعد کوئی چیز آنے والی ایسی ہے جسے وہ اپنا بچہ کہتی ہو، بلکہ اسے یہ تک علم نہیں ہے کہ وہ یہ کام اپنی نوع کی حفاظت کے لیے کرتی ہے۔

چیونٹیوں میں سے بعض کی یہ ڈیوٹی ہوتی ہے کہ وہ سردیوں کے موسم میں اپنی کالونی کو خوراک مہیا کرنے کے لیے حیوانات جمع کریں، وہ ایک اسٹور قائم کرتی ہیں جہاں یہ خوراک پیش کررکھی جاتی ہے، پھر بعض چیونٹیاں ایسی ہوتی ہیں کہ جن کو قدرت نے پیسنے کے جبڑے دیئے ہیں، ان کا کام صرف خوراک کو پیسنا ہوتا ہے، جب سردیوں کا موسم آتا ہے اور تمام غلہ پیسا جاچکا ہوتا ہے تو اس کی سپلائی یوں ہوتی ہے کہ زیادہ سے زیادہ تعداد کو فائدہ پہنچایا جاسکے تاکہ سپلائی

جاری رہ سکے، اب چونکہ اگلی نسل میں مزید پسینے والی چیونٹیاں پیدا ہوں گی، اس لئے چیونٹیوں کی فوج ان پسینے والیوں پر حملہ آور ہوتی ہے اور ان کو قتل کر دیتی ہے، شاید ان کا ضمیر مطمئن ہوتا ہے کہ انہوں نے اپنے حصے کی خوراک پسینے کے دوران کھالی ہے، کیونکہ انہوں نے اس موقع سے ضرور فائدہ اٹھایا ہوگا۔

بعض چیونٹیاں ایسی ہوتی ہیں کہ ان کی جبلت یا ان کی عقل ان کو کھانوں کے باغ بنانے پر آمادہ کرتی ہے اور یہ چیونٹیاں ابتدائی کیڑوں کو اور پودوں کے چھلکوں پر پائے جانے والے کیڑوں کو گرفتار کر لیتی ہیں، یہ گویا ان کے لئے گائے اور بکریوں کا کام دیتے ہیں، ان کیڑوں سے یہ چیونٹیاں ایسا محلول لیتی ہیں جو شہد کی طرح ہوتا ہے اور یہ چیونٹیوں کی خوراک کا کام دیتا ہے۔

چیونٹیاں بعض دوسری چیونٹیوں کو غلام بھی بنالیتی ہیں اور جب یہ اپنے گھونسلے بناتی ہیں تو یہ پتوں کو مناسب حجم میں کاٹتی ہیں، جب کارکن چیونٹیاں ان پتوں کو ایک طرف سے پکڑ کر اپنے مقام پر رکھتی ہیں تو اس وقت یہ ان بچوں سے بھی کام لیتی ہیں جو ابھی ارتقائی دور میں ہوتے ہیں، لیکن ان کے ریشمی مواد سے یہ پتوں کو جوڑتی ہیں، یوں یہ بچے اپنے لیے گھونسلا بنانے سے محروم رہتا ہے، لیکن اپنے بنی نوع کیلئے ایک مفید کام کر چکا ہوتا ہے، سوال یہ ہے کہ جن ذروں سے چیونٹی بنتی ہے ان ذروں میں یہ کام کرنے کی صلاحیت کس طرح پیدا ہوجاتی ہے؟''

اس میں شک نہیں ہے کہ ان کا ایک خالق ہے جس نے ان کو اس طرح کر نیکی ہدایت کی، خواہ وہ بڑی مخلوق ہو یا چھوٹی ہو اور یہ وہی خالق ہے جو ''الاعلیٰ'' ہے۔
(ماخوذ از: فی ظلال القرآن)

اوریا مقبول جان

اسلام سے بغض وحسد کی آگ کیوں؟

دنیا بھر میں بہت سے لوگ خصوصا سیکولر، لبرل، آزاد منش اور اسلام سے خصوصی بغض وعناد رکھنے والے دانشور ایک عجیب وغریب جلن اور کڑھن میں مبتلا رہتے ہیں۔ انہیں مسجدوں کی طرف ذوق وشوق سے جاتے ہوئے لوگ اچھے نہیں لگتے، روزانہ حرم پاک ومسجد نبوی میں بڑھتی ہوئی زائرین کی تعداد ان کے دلوں پر چھریاں چلاتی ہے، یہاں تک کہ انہیں عید قرباں پر لوگوں کا ایک شوق کے ساتھ جانور خرید کر سنت ابراہیمی ادا کرنا بھی سخت برا لگتا ہے۔ اپنی اس جلن، کڑھن اور اسلام دشمنی کی وجہ سے کھولتے ہوئے دماغ سے چند مفروضے تراشتے ہیں اور پھر ان کا پوری امت پر اطلاق کر دیتے ہیں۔

ان میں سے پہلا مفروضہ یہ ہے کہ ہر نمازی فرد جو اللہ کے سامنے گڑگڑا کر اپنے گناہوں کی معافی مانگ رہا ہے، یہ دراصل ایک بددیانت، چور، کم تولنے اور لوگوں کے حقوق غصب کرنے والا ہے اور اسے یہ سکھادیا گیا ہے کہ تم قتل کرلو، ڈاکہ مارلو، یتیم کا مال کھالو، بس نماز میں اللہ کے سامنے گڑگڑا کر رو لو، تمہارے گناہ معاف ہوجائیں گے۔ انہیں مسلمانوں کی اجتماعی عبادتوں میں اسراف اور فضول خرچی نظر آتی ہے اور وہ اٹھتے بیٹھتے اس بات کا ذکر کرتے ہیں کہ جتنا پیسہ حج اور عمرے پر خرچ ہوتا ہے، اس سے کسی غریب کی مدد کی جائے، کسی بیوہ، یتیم اور مسکین کا سہارا بنا جائے۔ انہیں سال میں ایک دن جانور ذبح کرنا بھی فضول خرچی لگتی ہے اور وہ اس دکھ میں گھلے جاتے ہیں کہ یہ سارا پیسہ اکٹھا کر کے کوئی یتیم خانہ یا سکول کیوں نہیں کھول لیا جاتا۔ اپنے اس بغض وعناد اور اسلام دشمنی کی بنیاد پر انہوں نے چند سوال مرتب کیے ہوتے ہیں، جنہیں وہ اپنے ایسے مخصوص جدید علماء سے پوچھتے ہیں اور مرضی کا جواب حاصل کرتے ہیں، یا پھر ان دانشوروں، کالم نگاروں اور ادیبوں نے اپنے دماغ میں چند جاہل مولوی تراشے ہوتے ہیں، جو حقوق العباد کا ذکر تو نہیں کرتے، مگر یہ کہتے پھرتے ہیں کہ تم یہ عمل کرلوگے تو اتنے سالوں کے گناہ معاف ہوجائیں گے، یا اس اسم کی تسبیح کروگے تو اتنی ڈھیر ساری نیکیاں تمہارے دامن میں آجائیں گی۔

یہ جدید دانشور اور کالم نگار نابغے اپنے لطیفہ ساز دماغ سے ایسے مولویوں کے خاکے بھی تیار کرتے ہیں اور پھر انہیں اپنے کالموں کی زینت بناتے ہیں اور محفلوں میں تو کھل کر تضحیک کے

ساتھ بیان کرتے ہیں، جن میں وہ بے چارہ مولوی صرف عبادات کی تلقین کر رہا ہوتا ہے۔ اس کے بعد ان ''عظیم'' کالم نگار دانشوروں کا کمال یہ ہے کہ وہ کسی گاؤں کے سادہ مولوی کی گفتگو کے چند ٹکڑے اٹھا کر انہیں پوری امت مسلمہ پر چسپاں کر دیتے ہیں اور کہتے ہیں کہ یہ ہے ہمارے تمام مسلمانوں کا رویہ اور یوں وہ مسلمانوں کو بحیثیت مجموعی بدنام کرنے کا فریضہ ادا کرتے ہیں۔ ایسے ہی کئی ایک سوالات گھڑ کر جاوید غامدی صاحب کے سامنے اس طرح رکھے جاتے ہیں جیسے کسی کرکٹر کے سامنے ایسی گیند پھینکی جائے، جس سے وہ زبردست ہٹ لگا سکے، اور پھر وہ چھکا لگا دے۔ ایسا ہی ایک چھکا لگانے والا سوال غامدی صاحب کی سامنے رکھا گیا کہ ''کیا حج اور عمرے کرنے سے تمام گناہ معاف ہوجاتے ہیں؟ انہوں نے چھوٹتے ہی پوری مسلم امہ کو کٹہرے میں لا کر کھڑا کر دیا اور تمام مسلمانوں کو مجرم ٹھہرادیا۔ انہوں نے کہا کہ ''مسلمان یہ سمجھتے ہیں کہ وہ کسی کا حق مار لیں، ملاوٹ کر لیں، کم تول دیں، دھوکہ دے دیں، فریب دے دیں، وعدہ پورا نہ کریں، یہ سارے کام کر لیں اور اس کے بعد عمرہ کرنے چلے جائیں تو ان کے سارے گناہ معاف ہوجائیں گے۔'' اس کے بعد انہوں نے مغفرت اوبخشش کی وہ تمام آیات واحادیث بیان کر کے اس بات کا ذکر کیا کہ حقوق العباد یعنی بندوں کے حقوق اور ان کے حوالے سے کیے گئے گناہ کبھی معاف نہیں ہوتے۔ لیکن اس بات کو بھرپور طریقے سے ثابت کرنے کی کوشش ضرور کی کہ بحیثیت مجموعی پوری مسلم امہ میں یہ تصور راسخ ہو چکا ہے کہ عمرہ کرنے یا حج کرنے سے تمام چوریاں، ڈاکے، حق تلفیاں، وعدہ خلافیاں اور قتل تک معاف ہوجاتے ہیں۔ یہ فقرہ بازی اور الفاظ کا چناؤ بہت غضب کا ہوتا ہے اور اس سے یہ تاثر مضبوط کرنا مقصود ہوتا ہے کہ عمرہ اور حج کرنے والا دراصل ایک خائن، چور، بددیانت، وعدہ خلاف اور حق تلف کرنے والا ہے۔

جب اس طرح کا جواب موصول ہوجائے پھر غامدی صاحب کے اس ''ارشاد گرامی'' کو تمام اسلام دشمن، سیکولر، لبرل، دانشور، کالم نگار اور اینکر پرسن گلے کا تعویذ بنالیتے ہیں۔ غامدی صاحب کو پوری امت پر یہ فقرہ چسپاں کرنے اور انہیں اس غلط فہمی کا شکار بنانے سے پہلے چند لمحوں کے لئے غور کر لینا چاہیے، اپنے اور اردگرد دیکھ لینا چاہیے کہ اس ملک میں بلکہ پوری مسلم امت میں کون لوگ ہیں، جو زیادہ خیرات کرتے ہیں، کون ہے جو یتیم خانے، ہسپتال اور مسکینوں کے ادارے چلاتے ہیں۔ کون ہے جو سیلاب، زلزلے، آفت وبیماری میں اپنی جمع پونجیاں نکال کر نچھاور کر دیتے ہیں۔ آپ کو کراچی سے لے کر گلگت تک ان میں سے ننانوے فیصد ایسے لوگ ملیں گے جو دین دار ہوں گے، جو اللہ سے ڈرتے ہوں گے، جنہیں روزِ حشر جواب دہی کا احساس ہوگا، جن کی آنکھیں گناہوں کے احساس سے بھیگی رہتی ہوں گی۔ اس میں بریلوی، دیوبندی، اہلحدیث، شیعہ غرض ہر فرقے کا دین پر عمل کرنے والا ہی آپ کو ملے گا۔ گزشتہ دس سالوں سے میں پاکستان اور پاکستان سے باہر بے شمار رفاحی اداروں کے لیے فنڈ اکٹھا کرنے کے لئے جاتا رہا ہوں۔ صرف چند دن پہلے میں نے الخدمت کے کفالت یتیم بچوں کے پروگراموں میں شرکت کی اور لوگوں سے یتیموں کے سروں پر ہاتھ رکھنے کے لئے پیسہ مانگا، تیس کروڑ سے زیادہ جمع ہوا۔ ڈاکٹر آصف جاہ نے تھر کے پیاسوں کے لئے کنویں لگانا شروع کیے، ان کے لیے بھیگ مانگی، لوگ جوق درجوق امڈ پڑے، مسجدوں میں جمعہ کے اجتماعات میں شام اور روہنگیا کے مسلمانوں کی مظلومیت کا رونا رویا تو لوگوں نے کروڑوں روپے قدموں میں ڈھیر کر دیے، حبیب فاؤنڈیشن کے لیے شام کے بے آسرا لوگوں کی مدد کو کہا تو لوگ مدد کے لیے امڈ آئے۔

میں اللہ کے جلال کی قسم اٹھا کر کہتا ہوں کہ ''غامدی صاحب، ان خیرات کرنے والوں میں اکثریت اور اکثریت بھی ننانوے فیصد تک ایسی تھی، جو اللہ سے ڈرتے تھے، اس کے خوف سے کانپتے تھے، جن کی راتیں بے چین ہوجاتی تھیں کہ اگر انہوں نے اپنے مسلمان یتیم بھائی کی مدد نہ کی تو روز حشر وہ رسول اکرم ﷺ کی شفاعت کیسے حاصل کر سکیں گے۔ یہ لوگ مسجدیں بھی آباد کرتے ہیں، قربانی بھی کرتے ہیں اور حج اور عمرہ پر بھی شوق سے جاتے ہیں۔'' ذرا آپ آنکھ کھول کر اس امت مسلمہ کا یہ روپ تو دیکھ لیتے، آپ کو کبھی اس امت کو بحیثیت مجموعی مجرم ٹھہرانے کی جرأت نہ ہوتی۔ آپ میرے محترم ہیں، میرے استاد رہے ہیں، لیکن آپ کے یہ جملے دنیا کے سامنے پوری امت مسلمہ کا بدترین روپ پیش کرنے کے لیے استعمال ہوتے ہیں۔ مجھے یقین ہے آپ نے ہرگز یہ فقرے سوچ سمجھ کر اس نیت سے نہیں کہے ہوں گے۔ لیکن کیا کروں، آپ کے ان فقروں سے میرا اسلام دشمن کالم نگار آپ کو جدید اسلام کا علمبردار دکھا کر پوری اسلامی تاریخ کو قصوروار بنا دیتا ہے۔ آپ عالم ہیں، آپ کو بخوبی علم ہے کہ رسول اکرم ﷺ کے زمانے سے لے کر آج کی تبلیغی جماعت کے ''فضائل اعمال'' تک کسی بھی جگہ یہ تحریر نہیں ملے گی کہ کوئی عالم کیا سادہ سا مولوی بھی اس بات پر یقین رکھتا ہو کہ حقوق العباد اور بندوں کی حق تلفیاں عبادات سے معاف ہوجاتی ہیں۔ لیکن شاید آپ لوگوں کو حق کی یہ بات بتانا نہیں چاہتے

کہ تمام مسلمان علماء وصلحاء چودہ سو سال سے مسلسل یہ بیان کرتے آئے ہیں کہ روز حشر بندوں کی حق تلفیوں کا فیصلہ بندوں کے ساتھ معاملہ کرکے ہی طے ہوگا۔

کیونکہ اگر آپ نے لوگوں کو یہ بتادیا کہ امام ابو حنیفہ سے لے کر حقانی مسجد کا مولوی تک سب اس بات پر یقین رکھتے ہیں تو پھر آپ کی بات نئی کیسے ثابت ہوگی۔ میں خوف سے کانپ اٹھتا ہوں، جب میں یہ سوچتا ہوں کہ آپ کے کہے ہوئے یہ چند فقرے جو تمام دانشور سیکولر کالم نگار، اسلام، دین اور مسلم امہ کی تضحیک اور تمسخر کے لیے استعمال کرتے ہیں، جن سے ایک سادہ لوح مسلمان گمراہ ہوتا ہے، یہ سب آپ کو اللہ کے کٹہرے میں نہ کھڑا کردیں۔ اللہ آپ کو حق بات کہنے کی توفیق دے اور حق بات یہ ہے کہ یہ امت اپنی تمام تر خرابیوں کے باوجود سب سے زیادہ خیرات کرنے والی قوم ہے۔ ان اسلام دشمن دانشوروں کا کیا ہے، پوری دنیا میں روزانہ کروڑوں ٹن گوشت کھایا جائے انہیں خوشی ہوتی ہے، لیکن ۳۶۵ دنوں میں صرف ایک دن مسلمان قربانی کرلیں تو ان کا دل بیٹھنے لگتا ہے۔ یہ اس شخص سے سوال نہیں کرتے جو ہر سال اپنے تعیش کے لیے یورپ امریکہ اور دیگر مقامات پر سیر کے لئے جاتا ہے اور ان میں سے اکثریت چور، بددیانت اور رشوت خوروں کی ہوتی ہے۔

بلکہ یہ کالم تحریر کریں گے کہ سیاحت کو فروغ دیا جائے، لیکن حج وعمرہ کی رونقیں ان کا دل جلاتی ہیں۔ یہ ہر نمازی، داڑھی والے کو بددیانت، ملاوٹ کرنے والا اور چور ثابت کریں گے۔ انہیں پاکستان کی جیلوں میں لاکھوں مجرم نظر نہیں آتے، جن میں ایک فیصد بھی دین پر عمل کرنے والے نہیں ہوتے۔ پاکستان کی سیاسی اشرافیہ، بیوروکریسی، عدلیہ اور صحافت میں بے ایمانوں، چوروں، بددیانتوں، غاصبوں اور ڈکیتوں کی تعداد نکال لیں، آپ کو ایک فیصد بھی ایسے نہیں ملیں گے، جو اللہ کے دین پر بظاہر ہی عمل کرنے والے ہوں۔ اللہ نے قرآن پاک میں ان جیسے دانشوروں کو ''دل کے کوڑھ'' کا مریض کہا ہے اور اللہ فرماتا ہے کہ وہ ان کے مرض میں دن بدن اضافہ کرتا رہتا ہے۔ اللہ کا دین پھیلتا ہے اور یہ بغض وحسد کی آگ میں جلتے ہیں۔

محمد موسیٰ بھٹو

سلیقۂ انسانیت

(جدید طبقات کے لئے قابل غور نکات)

(۱) لوگوں کا اتنا تیکھا محاسبہ نہ کریں کہ گویا تم ان کے رب ہو۔

(۲) زبان سے معیوب یا ناشائستہ بات نہ نکالا کریں، اس لئے کہ کہیں وہ زبان کا حصہ نہ بن جائے۔

(۳) روز مرہ زندگی میں ایسا عمل نہ کریں، جو نامناسب ہو، کہیں وہ عادت نہ بن جائے۔

(۴) ہمارے پاس کل سرمایۂ زندگی وقت ہے، وقت کے صحیح استعمال کی فکرمندی ناگزیر ہے۔

(۵) رات کو سونے سے پہلے دن بھر کی سرگرمیوں اور اعمال کا جائزہ لینا چاہئے اور آنے والے دن کو پہلے دن سے زیادہ دینی اعتبار سے کارآمد بنانے کی فکر ہونی چاہئے۔

(۶) پیسہ جمع کرنے کی فکر کو غالب نہ ہونے دیں، اس لئے کہ اس سے فرد دولت کی فکر میں گھر جاتا ہے، اللہ جو عطا فرمائے اس پر شکر ادا کریں، اگر یہ ہو تو اللہ سے مانگتے رہیں، اس کے پاس وسائل کی کمی نہیں، وہ ضرور اتنا عطا فرمائے گا جس سے محتاجی نہ ہوگی۔

(۷) روزانہ کچھ دیر کے لئے موت کا مراقبہ یا اس کا تصور ضرور جمانا چاہئے، موت کے وقت کیا حال ہوگا، قبر کی تنہائی میں کیا حال ہوگا، یہ مراقبۂ موت اگر کچھ دیر کے لئے بھی ہو تو دنیا کے بہت سارے غیر ضروری کام چھوٹتے چلے جائیں گے۔

(۸) یاد رکھیں، نیکی کی سو باتیں کرنے سے نیکی کے ایک عمل کا مظاہرہ کرنا، مثلاً کسی کی ضرورت کے وقت معاونت کرنا زیادہ بہتر ہے۔

(۹) کسی عزیز یا دوست سے نااتفاقی ہوجائے تو مصالحت وقربت میں سبقت سے کام لینا چاہئے، یہ بڑی سعادت کی بات ہے۔

(۱۰) کوشش فرمائیں کہ کسی بھی مسلمان کے بارے میں آپ کے دل میں میل پیدا نہ ہو، اگر کوشش کے باوجود میل موجود ہوتو اس کے لئے دعائے خیر کریں۔

(۱۱) مخالف کو معاف کرنے کا ظرف پیدا کریں، بلکہ اس کے لئے دعائے خیر کرنے کی کوشش کریں، اس سے زندگی کی خوشی میں اضافہ ہوجائے گا۔

(۱۲) گھر میں اہل خانہ سے معاملات کے وقت نرمی، بُردباری، صبر اور آخری حد تک معافی کا مظاہرہ فرمائیں، اس سے آپ کی گھریلو زندگی خوشگوار سے خوشگوار تر ہوجائے گی اور بچوں کی صحتمند بنیادوں پر تربیت میں مدد ملی گی۔

(۱۳) انسان دو حالتوں سے خالی نہیں ہے یا تو اللہ کی طرف سے اس پر عطا ہوتی ہے یا ابتلا وآزمائش، عطا کے وقت شکر ادا کرنا چاہئے اور آزمائش وتکلیف کے وقت صبر۔ حدیث قدسی ہے کہ جوشخص میری نعمت کے موقعہ پر شکر ادا نہ کرے اور تکلیف کے وقت صبر نہ کرے، اسے چاہئے کہ وہ اپنے لئے آسمان سے نیچے دوسرا رب تلاش کرے۔

(۱۴) میٹھا بول بولنے کی عادت ڈالئے، اس سے آپ کی زندگی حلاوت سے سرشار ہوجائے گی۔

(۱۵) تیرے علم اور تیری دولت میں دوسرے مسلمانوں کا بھی حق ہے، اس حق کی ادائیگی کی فکر فرمائیں، یہ حق زکوٰۃ کے علاوہ خیر وخیرات کی صورت میں بھی عائد ہوتا ہے۔

(۱۶) اللہ سے تعلق مستحکم کریں، آپ کے بگڑے ہوئے سارے مسائل ومعاملات درست ہوجائیں گے، یا مسائل کا احساس شدت باقی نہ رہے گا نیز صبر وشکر کے ساتھ ساتھ سکون کی حالت طاری ہوگی۔

(۱۷) ذہانت، اللہ کا بڑا انعام ہے، لیکن جس ذہانت میں معرفت نفس ومعرفت رب کے اجزاء اور انوار دل شامل نہ ہوں، وہ ذہانت آفت ہے، آفت، اس سے معاشرے میں فساد ہی پیدا ہوتا ہے۔

(۱۸) اللہ اللہ کرتے رہنے سے دل اور ورح کی تشنگی دور ہوتی ہے اور ان کی تشفی ہونے لگتی ہے، نفس کے مہذب ہونے کی صورت بھی پیدا ہوتی ہے، نیز عقل کے فکری خطوط کی نوعیت صحتمند ہوجاتی ہے، کثرت سے تکرار ذکر سے اطاعت میں بھی آسانی پیدا ہونے لگتی ہے۔

(۱۹) جب خالق سے تعلقات درست ہوتے ہیں تو اس سے بندوں سے تعلقات کی بہتری کی ازخودصورت پیدا ہونے لگتی ہے، خالق سے تعلقات کا استوار ہونا رسمی عبادت سے نہیں ہوسکتا، اس کے لئے راہ محبت ومعرفت کے ذریعہ نفسی قوتوں کو پامال کرنا پڑتا ہے۔

(۲۰) دنیا میں موجود سارا فساد نفس کے حداعتدال سے تجاوز کرنے کے نتیجہ میں ہی پیدا ہوا ہے، نفس دوسروں پر بالادستی چاہتا ہے، نفس زیادہ سے زیادہ دولت چاہتا ہے، نفس بے لاگ خواہشات کی تکمیل چاہتا ہے، اس لئے نفس کی تہذیب کا کام سارے کاموں سے زیادہ اولیت واہمیت کا مستحق ہے۔

(۲۱) علم حاصل کرنے کی کوشش کریں، دینی علم بھی تو دنیاوی علم بھی، لیکن تزکیہ، تقویٰ، معرفت اور نور بصیرت کے علم کے حصول سے غافل نہ ہوں، اس لئے کہ اس علم سے غفلت کی وجہ سے فرد کے لئے، دنیا پر ٹوٹ پڑنے اور دوسروں کی تحقیر جیسے رزائل سے بچنا محال تر ہے، نور بصیرت کا علم سارے علوم پر بھاری ہے، اس لئے کہ انسانیت کا جوہر اسی سے وابستہ ہے۔

(۲۲) سلیقہ انسانیت کا ایک اہم نکتہ یہ ہے کہ فرد اپنے جیسے دوسرے انسانوں کے لئے دکھ، اذیت اور تکلیف کا باعث نہ بنے، بلکہ اپنی ذات سے انہیں جتنا نفع پہنچا سکتا ہے پہنچائے۔ اس روش سے اس کی زندگی خیر وبرکت سے عبارت ہوجائے گی، اور آنے والی آفتوں سے اس کے لئے بچاؤ کی صورت پیدا ہوگی۔

(۲۳) قساوت قلبی اور سنگ دلی جیسی بیماریاں انسانیت کے سراسر منافی ہیں، ان بیماریوں سے بچنے کا خصوصی اہتمام ہونا ضروری ہے، اس دور میں مادی تہذیب

اور مادہ پرستی کی عمومی فضا نے ان بیماریوں کو عام کر دیا ہے، اس لئے ماہر ڈاکٹر، وکیل بڑے سرکاری افسران اور سارے مؤثر طبقات دولت کے حصول کی خاطر سنگ دلی وقساوت قلبی کا شکار ہوگئے ہیں اور لوگوں سے بھاری فیس اور رشوت لے کر ان کے لئے عذاب کا موجب بن گئے ہیں، دکھ کی بات یہ ہے کہ سنگ دلی کی اس روش کے انسانیت کے منافی ہونے کا ہی ادراک سلب ہوگیا ہے۔

یاد رکھیں، اللہ کی غریب، بے بس، اور بے وسیلہ بندوں کی جیب پر ڈاکہ ڈالنے کے بعد آپ سکون کی نیند ہرگز نہیں سو سکتے اور دنیا کے حوالے سے آپ کی بڑھتی ہوئی ہوس کی تکمیل کبھی نہیں ہوسکتی۔ یہ اہم نکتہ ہے جسے سمجھنا ازحد ضروری ہے۔

(۲۴) دل میں انوار الٰہی کا ہونا ضروری ہے (جو اللہ کے کثرت ذکر سے پیدا ہوتے ہیں) دوسری صورت میں دل میں فتنوں کے قبول کرنے کی صلاحیت میں اضافہ ہوگا، بلکہ دل فتنوں کا آماجگاہ بن جائے گا۔

جو دل غیر اللہ سے آباد ہوتا ہے، اس دل میں اللہ داخل نہیں ہوسکتا۔

(۲۵) دوسروں کی عزت نفس کو ملحوظ رکھنا ضروری ہے، عام معاملات اور معاشرت میں اس کا خصوصی اہتمام ہونا تو ناگزیر ہے، جو اہل قلم اس سلیقہ سے بہرہ ور نہ ہو، وہ جائز تنقید کے نام پر دوسروں کی تحقیر وتذلیل پر اتر آئے بغیر رہ سکے، مشکل ہے، ہر وہ معاشرہ جو اخلاقی زوال کا شکار ہوتا ہے، وہ سلیقۂ انسانیت کے اس اہم نکتہ کو سمجھنے سے قاصر ہوتا ہے۔

(۲۶) دنیا کا ادھورہ پن فرد کے لئے نعمت ہے، اس لئے کہ اللہ سے مانگنے اور اس سے رجوع ہونے میں یہ معاون ہے، جب کہ معاشی فراوانی ایک اعتبار سے زحمت ہے، اس لئے کہ اس سے شخصیت کی صحیح سمت میں تعمیر کی راہ میں سخت رکاوٹیں اور مشکلات پیدا ہوتی ہیں اور فرد کی مضبوط مالی حیثیت اسے عام طور پر بڑے پن کی سطح پر لے جانے کا ذریعہ بنتی ہے۔ کمزور مالی حیثیت فرد کو اپنی حیثیت کو سمجھنے، عاجزی اور فروتنی کی راہ پر گامزن کرتی ہے اور رجوع الی اللہ کا ذریعہ بھی بن جاتی ہے۔

(۲۷) زندگی کا سارا حسن، حلاوت، لطافت، سلیقۂ انسانیت اور توازن ذکر ہی سے وابستہ ہے کہ ذکر میں خالق ہستی کے اجزائے حسن کی منتقلی کا عمل شروع ہوتا ہے، جو فرد کو باطنی طور پر حسن سے سرشار کردیتا ہے۔

(۲۸) قرآن میں ہے "**الم یعلم بان اللہ یریٰ**" (کیا انسان نہیں جانتا کہ اللہ اسے دیکھ رہا ہے)۔

اللہ کے دیکھنے کا یہ تصور جب مستحکم ہوتا ہے تو نفس کی سرکشی کا زور ٹوٹنے لگتا ہے اور اللہ کے دھیان کے غلبہ کے زیر اثر اللہ اور اس کے رسول کی اطاعت آسان ہوجاتی ہے، اللہ کے تصور اور دھیاں کے غلبہ کو تصوف کی اصطلاح میں مراقبہ کہتے ہیں۔

(۲۹) بے جا تنقید اور تنقید کو وظیفہ بناتے رہنا، یہ ہماری عمومی روش ہوگئی ہے، جس سے ملت کی وحدت بُری طرح متاثر ہے اور معاشرہ تقسیم در تقسیم کی راہ پر گامزن ہے، ہر ذہین وباصلاحیت فرد یہ سمجھتا ہے کہ وہ صحیح ہے، باقی سب غلط ہیں، جب دوسرے غلط ہیں تو ان کو صحیح راستہ پر گامزن کرنا، اس کی ذمہ داری ہے، حالانکہ تحلیل نفسی سے معلوم ہوگا کہ یہ نقطہ نگاہ غلط فہمی کا نتیجہ ہے اور اغوائے نفس کا نتیجہ ہے، حقیقت یہ ہے کہ نفس کی وسعت وگہرائی سمندر کی گہرائی سے زیادہ ہے، فرد جب خود احتسابی کے ذریعہ اندر میں غوطہ زن ہوتا ہے تو اسے نفس کی اس طرح کی حیرت انگیز واردات کا ادراک ہوتا ہے، اس کے بعد اس کی تنقید میں محبت آمیزی شامل ہوجاتی ہے، جس سے معاشرہ ٹوٹ پھوٹ سے بچ جاتا ہے۔

(۳۰) سلیقۂ انسانیت کے حوالے سے ایک اہم نکتہ یہ ہے کہ دوسروں کے عیبوں کی طرف دیکھنے سے احتراز کرنا چاہئے اور خود احتسابی کے ذریعہ اپنے عیبوں کی طرف توجہ کو مرتکز کرنا چاہئے، توجہ اور نگاہ کی یہ خاصیت ہے کہ جب وہ ایک خاص رخ کی طرف ہوتی ہے تو وہ دوسری طرف منتقل نہیں ہوتی، اپنے عیب اتنے زیادہ ہیں اور نفسی خواہشات اتنی طاقتور ہیں کہ جب خود احتسابی کے ذریعہ اپنا محاسبہ

ہوگا تو فرد دوسروں کو بھول جائے گااور اپنے رزائل نفس کی اصلاح اس کا ہدف بن جائے گی، اس کے بعد وہ اس صلاحیت سے بہرہ ور ہوگا کہ دوسروں کی اصلاح کے لئے حکیمانہ اسلوب کے ساتھ کام کرے گا، جس سے افرادِ معاشرہ میں ٹوٹ پھوٹ کی بجائے اصلاح کی صورت پیدا ہوتی جائے گی۔

(۳۱) ذہن کو تیز سے تیز تر کرنا کوئی کمال نہیں، کمال یہ ہے کہ دل کی صلاحیتوں کو اجاگر سے اجاگر تر کیا جائے، جب دل کی صلاحیتیں کسی حد تک بیدار ہوجائیں تو اس کے بعد عقل کے استعمال سے بہتری کی صورت پیدا ہوسکتی ہے، دل کے تربیت یافتہ عقل سے جو مادی ترقی ہوگی، وہ انسانیت کو ہر طرح کے مفاسد سے بچانے کا باعث ہوگی، دوسری صورت میں نفس کا یرغمال شدہ عقل انسانیت کے لئے ہلاکت کا ذریعہ ہی ثابت ہوسکتا ہے۔

(۳۲) ہمارے مزاج کی ایک خرابی جس میں ہم انفرادی اور اجتماعی حیثیت سے مبتلا ہوگئے ہیں، وہ یہ ہے کہ ہم فضول خرچی کے عادی ہوگئے ہیں، آمدنی سے زیادہ اخراجات ہمارا معمول ہوگیا ہے، ہم نے غیر ضروری چیزوں کو ضروریات میں شامل کرکے، اپنے لئے مصیبت پیدا کردی ہے۔

ہماری ضروریات میں فرنیچر، بہتر گاڑی، قیمتی موبائل اور نہ معلوم کیا کیا چیزیں شامل ہوگئی ہیں، ان ضروریات کی تکمیل نے ہمیں رشوت، سرکاری خزانہ کی لوٹ مار، بدعنوانی، دھوکہ دہی، دوسروں کا مال کھا جانے اور اشیاء کی مہنگائی وغیرہ کی راہ پر ڈال دیا ہے۔حکمرانوں کی عیاشیوں نے آج ہمیں یہ دن دکھائے ہیں کہ ہم عالمی مالیاتی اداروں کے کھربوں ڈالر کے مقروض ہوگئے ہیں اور روزانہ ہمیں انہیں چھ ارب روپے قرضہ کی رقم سود سمیت واپس کرنی پڑتی ہے، یہ ساری صورتحال صرف اس لئے پیدا ہوئی ہے کہ ہم نے اسراف کی زندگی اختیار کی ہے، سادگی اور سادہ زندگی کو خیرآباد کر دیا ہے، قرآن نے اسراف کرنے والوں کو شیطان کا بھائی قرار دیا ہے۔